تفسیرِ قرآن کے اصول

امام حمید الدین فراہی

ترتیب و ترجمہ:
خالد مسعود

قرآن و سُنّت اکیڈمی نئی دہلی ۲۵

© قرآن وسنت اکیڈمی، نئی دہلی

طبع اول : اکتوبر ۲۰۰۳ء
قیمت : ۱۰۰ روپے

تقسیم کنندہ :

Al-Balagh Publications
10-Azami Apartment
N-1, Abul-Fazl Enclave
Jamia Nagar, New Delhi-25
Ph . 31030918,26914592
E-mail talha@vsnl.com

فہرست

پیش لفظ	5
تذکرہ مصنف	9
۱- قرآن میں تدبر و تفکر کی اہمیت	13
۲- قرآن مجید کی ترتیب	24
۳- قرآن-ایک مربوط و منظم کتاب	34
نظم قرآن کا علم کیوں ضروری ہے؟	45
۴- اصول تفسیر کو مدون کرنے کی ضرورت	61
۵- اصول تفسیر سے متعلق چند تمہیدی مباحث	82
معروف و منکر	82
قرآن اور سابقہ الہامی کتب میں تعلق	84
تفسیر کے خبری مآخذ	86
تفسیر کے لسانی مآخذ	90
شان نزول	96
متشابہات	99
۶- تفسیر قرآن کے اصول	103
۱- بنیادی اصول	104
(i) نظم کلام اور سیاق و سباق کا لحاظ	104
قرآن میں نظم کلام کی مشکلات	107

تلاش نظم میں مد اہم اشارات	113
سورہ اور اس کے اجزائے ترکیبی	129
سورتوں کے نام اور ان کی ترتیب	143
قرآن مجید کا مجموعی نظام	146
(ii) نظائر قرآن کی روشنی میں مفہوم کا تعین	153
(iii) کلام میں مخاطب کا صحیح تعین	165
(iv) الفاظ کے شاذ معانی کا ترک	178
ب- ترجیح کے اصول	181
ج- غلط اصول	190
۷- اصول تاویل	194
مراد معنی کو سمجھنے کا طریقہ	199
حواشی	222

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

قرآن فہمی اور قرآن مجید کی تفسیر کے موضوعات پر بیسویں صدی عیسوی میں جو کام ہوا ہے اس میں امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کا کام سر فہرست رکھنے کے لائق ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کو اپنے غور و فکر کا محور بنایا، اس سے متعلق علوم سیکھنے پر غیر معمولی محنت صرف کی، تفسیر قرآن کی چودہ صدیوں کی خدمات کا جائزہ لے کر تفسیر کی مشکلات کو سمجھا، ان دانشوروں کے طریق کار کا مطالعہ کیا جو قرآن کو اپنے افکار کا تابع بنا کر پیش کرتے ہیں اور ان کے فکر کی غلط بنیادوں سے آگاہ ہوئے، قرآن پر معاصر مستشرقین کے حملوں کو دیکھ کر غور کیا کہ امت کیوں ان کا جواب دینے سے قاصر ہے، مسلمانوں میں فرقہ بندی اور انتشار فکری کے اسباب کی تحقیق کی تو ان کی تہہ میں انہیں قرآن مجید سے بے اعتنائی اور اس کے مطالعہ کے اصولوں سے ناواقفیت کا سراغ ملا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ صدر اول کے مسلمانوں نے سرچشمہ ہدایت قرآن مجید ہی کو سمجھا اور اس کے مطالعہ میں عقل و نقل پر مبنی نہایت سادہ اصول تفسیر کو ملحوظ رکھا لیکن بعد کے ادوار میں جس طرح امت دوسرے معاملات میں صحیح موقف سے ہٹتی چلی گئی اسی طرح تفسیر قرآن کے ان فطری اصولوں پر بھی قائم نہ رہ سکی جو اسلاف نے اختیار کیے تھے۔

اس صورت حال میں ایک طریقہ تو یہ تھا کہ مولانا فراہیؒ حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے لیکن یہ بات اس احساس ذمہ داری کے منافی ہوتی جو ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ چنانچہ انہوں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا جو حقائق کا مواجہہ کرنے اور اصلاح احوال کے لیے اپنی ذمہ داری

ادا کرنے کا تھا- اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کردی تاکہ قرآن فہمی کی مشکلات کا حل امت کے سامنے پیش کر سکیں- چنانچہ انہوں نے وہی اصول تفسیر قائم کیے جو ان کے نزدیک صدر اول کے مسلمانوں کے لیے مشعل راہ تھے- ان کی وضاحت کے لیے کتابیں تحریر کیں، بعض مشکل سورتوں کی تفسیر لکھی اور اپنے طرز فکر پر چند ذہین علماء کی تربیت کی- ان کی اس محنت کا ثمرہ یہ ہے کہ اب تفسیر قرآن کا فراہی مکتب فکر ممیز ہو کر سامنے آچکا ہے اور دنیا مولانا فراہیؒ کو اس کا امام مانتی ہے جو بلاشبہ حقیقت پر مبنی بات ہے- ان کے طرز فکر کی نمائندہ مکمل تفسیر ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے 'تدبر قرآن' کے نام سے لکھی اور وہ اہل علم و فضل سے داد پا چکی ہے- اس وقت فراہی مکتب فکر اقوام عالم میں روشناس ہو رہا ہے اور برصغیر پاک و ہند کے علاوہ مغربی ممالک کے محققین اس کے منہاج تفسیر کو سمجھنے کے لیے کاوشیں کر رہے ہیں-

امام فراہیؒ کی چیدہ سورتوں کی تفسیر نظام القرآن (جو مجموعہ تفاسیر فراہیؒ کے نام سے بھی متعارف ہے) عرصہ دراز سے چھپ چکی ہے- اس کے مقدمہ کے طور پر لکھی گئی کتابیں اور اصول تفسیر سے متعلق رسائل بھی شائع ہو چکے ہیں- ۱۹۹۱ء میں تین رسائل ---دلائل النظام، اسالیب القرآن، اور التکمیل فی اصول التاویل ---دائرہ حمیدیہ (مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، یوپی، انڈیا) کے اس وقت کے ناظم مولانا بدرالدین اصلاحی مرحوم کی مساعی سے رسائل الامام الفراھی فی علوم القرآن کے نام سے یکجا شائع ہوئے- اللہ کا شکر ہے کہ امام فراہیؒ کے علوم قرآن پر مبنی باقی رسائل پر بھی دائرہ حمیدیہ میں کام ہو رہا ہے اور ان کے کچھ افادات اردو میں منتقل ہو کر شائع ہو چکے ہیں-

اس حقیقت کے باوصف کہ امام فراہیؒ کا منہاج تفسیر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے فیض یاب ہونے والے متعدد علمائے کرام کی تحریروں، بالخصوص مولانا امین احسن

اصلاحیؒ کی تفسیر تدبر قرآن اور دوسری کتابوں مثلاً مبادی تدبر قرآن اور اصول فہم قرآن سے کافی مبرہن ہو کر سامنے آچکا ہے، تاہم ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ امام فراہیؒ کی اپنی تحریریں بھی اردو داں طبقہ کی دسترس میں آجائیں۔اس میں دو مشکلیں حائل ہیں۔ایک یہ کہ امام فراہیؒ نے اپنی تحریروں کے لیے عربی زبان کو اختیار کیا جو اردو داں طبقہ کے لیے قابل فہم نہیں۔دوسری یہ کہ مذکورہ رسائل متفرق غیر مرتب تحریروں پر مشتمل ہیں جن میں ایک تصنیف کا ربط موجود نہیں۔مولانا بدرالدین اصلاحی مرحوم نے مواد تو تمام کا تمام چھاپ دیا لیکن اس میں تصنیف کی ترتیب قائم نہ کی۔لہذا یہ عظیم علمی ورثہ اردو داں طبقہ تک پہنچ سکا نہ عربی داں طبقہ ہی اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکا۔

اس وقت جب کہ اہل علم میں امام فراہیؒ کے وضع کردہ اصول تفسیر کے فہم کی طلب پائی جاتی ہے میں نے رسائل الامام الفراہی اور مقدمہ نظام القرآن کے مطالب کو ایک مربوط تصنیف کی طرح اردو میں مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔اس میں رسائل کا ترجمہ میرا ہے جبکہ مقدمہ میں سے لی گئی عبارتیں وہی ہیں جو اس کے اردو ترجمہ کی ہیں۔جو مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے کسی زمانے میں کیا تھا۔مطالب کو ترتیب دینے میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اس میں اصول بھی واضح ہو سکیں اور ان کے عملی اطلاق کی مثالیں بھی قاری کے سامنے آجائیں۔ہر مبحث کے مآخذ کی نشان دہی میں نے رسائل اور مقدمہ کے صفحات درج کر کے کر دی ہے۔صفحات سے پہلے 'ر' اور 'م' کی علامات بالترتیب 'رسائل' اور 'مقدمہ' کے حوالہ کے لیے درج کی ہیں۔مقدمہ کے لیے میرے پیش نظر مجموعہ تفاسیر فراہی، فاران فاؤنڈیشن، ۱۲۲ فیروز پور روڈ لاہور (اشاعت ۱۹۹۱ء) رہا ہے۔

کتاب کی یہ ترتیب رسائل اور مقدمہ کے تمام مباحث پر مشتمل نہیں ہے بلکہ میں نے اصول تفسیر اور ان سے متعلق مباحث کو اسی حد تک لیا ہے جو اصول کو واضح کرنے کے لیے میرے نزدیک ضروری تھے۔مصنف علیہ الرحمہ کے پیش نظر تصنیف کی ترتیب کیا

ہوتی؟ اس کا کوئی اشارہ مجھے نہیں ملا- چنانچہ موجودہ ترتیب کی تمام تر ذمہ داری صرف مجھ پر ہے لیکن میرے نزدیک اس عظیم علمی سرمایہ کو مفید بنانے کے لیے نئی ترتیب قائم کرنا ناگزیر تھا- جو لوگ امام فراہیؒ کے جملہ مباحث کا مطالعہ کرنے کے خواہشمند ہوں وہ اصل کتابوں کی طرف رجوع کریں کیونکہ مصنف علیہ الرحمہ کی ہر بحث اپنی جگہ تحقیق کا شاہکار ہوتی ہے-

اردو میں اصول تفسیر پر الفوزالکبیر مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سوا کوئی کتاب نہیں ملتی- لہذا توقع ہے کہ یہ کتاب قرآن مجید سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید ثابت ہو گی- وہ اس کی مدد سے نہ صرف فراہی مکتب فکر کے اصول تفسیر سے آگاہ ہوں گے بلکہ کلام اللہ کے فہم میں بھی اس کو ممد پائیں گے- وباللہ التوفیق-

لاہور

۱۳/اکتوبر ۱۹۹۹ء

خالد مسعود

تذکرۂ مصنف

امام حمید الدین فراہیؒ ۱۲۸۰ھ میں یوپی (بھارت) کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں پھریہا میں پیدا ہوئے- وہ مولانا شبلی نعمانیؒ کے ماموں زاد بھائی تھے- ان کا خاندان تعلیم اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے ضلع کا ایک معزز خاندان تھا- مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور انہوں نے قرآن حفظ کیا- انہوں نے عربی زبان کی ابتدائی تعلیم مولانا شبلیؒ سے حاصل کی اور دینی تعلیم کے لیے مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے حلقہ درس میں شریک رہے- اعلیٰ عربی زبان کی تعلیم کے لیے انہوں نے اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر مولانا فیض الحسن سارن پوری کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا- عربی، فارسی اور دینی علوم کی تحصیل کے بعد آپ نے علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا- وہاں انگریزی اور دوسرے جدید علوم کے ساتھ ساتھ خاص توجہ سے جدید فلسفہ پڑھا جس میں آپ کے استاد مشہور مستشرق پروفیسر آرنلڈ تھے- امام فراہیؒ نے الہ آباد یونیورسٹی سے گریجوایشن کی-

تعلیم سے فارغ ہوکر مولانا فراہی کئی سال تک مدرسۃ الاسلام کراچی سے بطور پروفیسر عربی وابستہ رہے- اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں تعینات ہوئے اور اسی دوران میں جرمن مستشرق یوسف ہارویز سے عبرانی زبان سیکھی- بعد ازاں آپ عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے الہٰ آباد یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے- وہیں سے آپ کی خدمات نظام دکن نے دارالعلوم حیدر آباد دکن کے پرنسپل کے عہدہ کے لیے لے لیں- یہ دارالعلوم اس زمانہ میں ریاست حیدر آباد کا سب سے بڑا سرکاری تعلیمی ادارہ تھا- حیدر آباد کے زمانہ قیام کے دوران میں مولانا فراہی کے سامنے ایک ایسی یونیورسٹی کا تخیل آیا جس میں تمام دینی و عصری علوم کی تعلیم اردو میں دی جائے- یہ تخیل بالآخر جامعہ عثمانیہ کی صورت اختیار کر گیا- لیکن حیدر آباد

کے حالات سے مولانا مطمئن نہ تھے- چنانچہ وہاں کی ذمہ داریوں سے استعفاد ے کر اپنے وطن واپس آگئے- یہاں انہوں نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا انتظام سنبھالا- اس کا نصاب جدید خطوط پر مرتب کیا اور مدرسہ کے امور کی نگرانی کرتے رہے- اس کے ساتھ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے علمی معاملات میں بھی برابر دلچسپی لیتے رہے- ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) میں متھرا کے ہسپتال میں آپ کا انتقال ہوا اور اسی شہر میں مدفون ہوئے-

امام فراہیؒ عربی اور فارسی کے اعلیٰ پایہ کے ادیب اور صاحب دیوان شاعر تھے- فلسفہ اور علم کلام سے بھی شغف تھا لیکن جو چیز ان کے دل و دماغ پر حاوی تھی وہ قرآن تھا جس کو سمجھنے کے لیے انہوں نے اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے اور اس کے اسالیب کلام کو سمجھنے کا حق ادا کر دیا- انہوں نے قرآن مجید پر براہ راست غور و فکر کی طرح ڈالی، اس کے اصول متعین کیے اور قرآن فہمی کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے حکمت قرآن کے دروازے کھلیں اور مسلمان مغرب کی فاسد عقلیت سے مرعوب ہونے کے بجائے قرآن کی صالح عقلیت کی مدد سے اس کا مقابلہ کرنے کے اہل ہوں- امام فراہی نے قرآنی علوم پر بیسیوں رسالے رکھے جن میں سے بعض شائع ہو چکے ہیں اور باقی ناتمام حالت میں مسودات کی شکل میں ہیں-

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں امام فراہیؒ نے ۱۹۲۵ء میں اساتذہ کے لیے قرآن مجید کا تحقیقی درس شروع کیا- یہ سلسلہ ۱۹۳۰ء میں ان کی وفات تک جاری رہا- اس حلقہ درس سے مستفیض ہونے والوں میں مولانا اختر احسن اصلاحیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ بوے نمایاں ہیں- مولانا اختر احسنؒ زندگی بھر مدرسہ الاصلاح سے وابستہ رہے اور سینکڑوں شاگردوں کو مطالعہ قرآن کے طریق کار کی تربیت دی- مولانا امین احسنؒ نے تفسیر تدبر قرآن کے علاوہ اپنی کئی گراں قدر تصانیف چھوڑی ہیں اور اپنے کچھ تلامذہ کو اپنے بعد کام کے لیے تیار کیا ہے-

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الصانع الخلق على اكمل نظام و احسن قوام، الواضع الاشياء فى اجدر مقام و ارفق مصام- والصلوة والسلام على المويد بابلغ كلام ، و خاتم النبوة بالاتمام، كبدر تجلى من بين الغمام، محمد المبعوث لهداية كافة الانام الى سبل السلام و على آله و اصحابه الكرام ، الى مدى الليالى والايام

قرآن میں تدبر و تفکر کی اہمیت

انسان کے لیے سعادت کی انتہا یہ ہے کہ وہ رضائے الٰہی کے حصول اور عہد فطرت کے ایفا کی جدو جہد کرے اور اللہ تعالیٰ کی غلامی اور اس پر دلی خوشی اور اطمینان کی کیفیت سے سرشار ہو۔ اس انتہائے سعادت تک پہنچنے کا وسیلہ قرآن مجید سے فائدہ اٹھانا، اسے سیکھنا اور سکھانا، اس پر عمل کرنا اور لوگوں کو اس کی ترغیب دینا ہے۔ قرآن کریم سے آدمی کا یہ تعلق اس کے ایمان واسلام کی تصدیق کرتا اور اس فطرت انسانی کی تکمیل کرتا ہے جو مسجود ملائکہ بنی تھی۔

انتہائے سعادت کی طرف بلند ترین زینہ قرآن سے یہی تعلق ہے جبکہ ابتدائی زینہ انسان کی خاص صفت گویائی (نطق) کی تربیت ہے جو انسان کی تمام قلبی وذہنی صفات کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان کی صفت گویائی جب صحیح خطوط پر ارتقاء کرے اور اس میں کجی واقع نہ ہو تو اس کی منزل قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بولنے اور پڑھنے والا اسی لیے بنایا کہ وہ اس ہدایت کو حاصل کرنے کے قابل ہو سکے جس کا وعدہ اس کے رب نے اس کے ساتھ کر رکھا ہے اور اللہ کی نشانیوں اور کلام سے فائدہ اٹھاسکے تاکہ اس کے اتارے ہوئے نور سے روشنی پائے اور اس پر رب کی نعمت اور رحمت کی تکمیل ہو۔ قرآن میں ارشاد ہوا :

الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمه البيان (الرحمٰن ۱-۴)

(خدائے رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا، اسی نے اس کو بولنا سکھایا)

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا اس کی طرف ان آیات میں نہایت مختصر الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ابتدا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ذکر سے کی کیونکہ وہی رحمت اور تعلیم کا آغاز

کرنے والی ہے۔ پھر یہ بتایا کہ خدا کی رحمت کی تکمیل قرآن مجید کی تعلیم کے ذریعہ سے ہوئی۔ پھر فرمایا کہ خدائے رحمٰن نے ہی تمہیں زندگی بخشی اور بولنا سکھایا تاکہ تم قرآن مجید کی یہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہیں سے سنن ابن ماجہ کی اس روایت کی حکمت واضح ہوتی ہے کہ خیرکم من تعلم القرآن و علمہ (تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے)

نبی کریم ﷺ نے قرآن کو چونکہ اللہ تعالیٰ سے سیکھا اور امت کو اس کی تعلیم دی، اس لیے حضور بلا شک و شبہ سب سے بہتر انسان تھے۔ حضورؐ کے بعد لوگوں میں سب سے اچھے وہ ہیں جنہیں حضورؐ نے تعلیم دی اور انہوں نے آگے یہ علم پھیلایا۔ علیٰ ہذا القیاس، فرق مراتب کے ساتھ اسباب و وسائل کی کثرت و قلت، خلوص نیت اور استقلال کی کمی بیشی کے مطابق دوسرے لوگوں کا درجہ ہے۔ پروردگار کی تعلیم قبول کرنے اور اس کے بندوں تک اس کو پہنچانے سے بڑی بھلائی کیا ہو سکتی ہے؟ انسان کے لیے اس سے بڑھ کر خیر و برکت کی چیز بھلا کیا ہو گی کہ وہ اس مقصد کو پالے جس کے لیے اللہ نے اسے پیدا کیا؟ اگر تم یہ کہو کہ خدا نے تو انسان کو عمومی طور پر عبادت کے لیے پیدا کیا تھا پھر وہ اس کو قرآن کے سیکھنے سکھانے کے مخصوص کام کے لیے کیوں تیار کرنا چاہتا ہے تو ہمارا جواب یہ ہے کہ ہر قوم خدا ہی کی عبادت کی دعویدار ہے مگر اس کی عبادت باطل اور ضائع ہوتی ہے جب تک وہ رب کی تعلیم اور ہدایت کے مطابق نہ ہو۔ قرآن تو ہے ہی رب کی تعلیم اور ہدایت۔ اس اعتبار سے یہ عبادت کی بنیاد، اس کا محور اور عبودیت کا مغز اور جوہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی تلاوت عبادت قرار پائی ہے۔(ر:۲۶-۲۷)

قرآن فہمی کا دارومدار تدبر پر ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ھوالذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا (بقرہ ۲۹)

(وہی ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے)

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم زمین کی بے شمار اشیاء کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔ ان میں سے کتنی اشیاء ایسی ہیں جن کو ہم پہلے بے خبری میں استعمال کرتے رہے لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے علم میں اضافہ کر دیا تو ہم نے ان کو اپنے لیے مزید نفع بخش بنا لیا۔ کتنی اور چیزیں ایسی ہیں جن کے فوائد ہم پر ابھی تک مخفی ہیں۔ ہم روز بروز ان کے بارے میں اپنی معلومات کو بہتر بنا رہے ہیں اور ایسا کرنے کے بعد ان کو استعمال میں لائیں گے۔ اس کے باوجود لاتعداد اشیاء پھر بھی ایسی باقی رہ جائیں گی جن کے اسرار سے ہم واقف نہ ہو سکیں گے۔ ٹھیک یہی حال علوم کا ہے۔ ان میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور جب تک اللہ چاہے گا یہ اضافہ ہوتا رہے گا۔

علیٰ ہذا القیاس، قرآن کی صفت یہ ہے کہ یہ بیان کا سہل ترین طریقہ اختیار کرتا ہے اور یہ اپنے مفہوم میں واضح اور روشن کتاب ہے۔ اسی بنا پر اس کو 'نور' اور 'تفصیل' قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ نور اسی معنی میں ہے جس معنی میں سورج آنکھیں رکھنے والوں کے لیے ایک واضح چیز ہے۔ سو اندھوں کو نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے قارئین سے تدبر، تفکر اور توسّم کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ پڑھنے والے پر اسی قدر کھلتا ہے جتنا وہ اس پر غور کرتا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ ہمیشہ سے نفع بخش، ہدایت دینے والی اور واضح ہے لیکن اس کے ساتھ یہ گہری حکمتوں اور لوب کی باریکیوں کا سرچشمہ بھی ہے۔ جس طرح دوسرے علوم میں آدمی جوں جوں ترقی کرتا ہے وہ معلوم سے غیر معلوم تک رسائی حاصل کرتا چلا جاتا ہے، اسی طرح قرآن مجید میں بھی ارشاد ہوا:

والذین اھتدوا زادھم ھدی و اتٰھم تقوٰھم (محمد، ۱۷)

(اور وہ لوگ جنہوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی اللہ نے ان کی ہدایت میں افزونی بخشی اور ان کے حصہ کا تقویٰ ان کو عطا کیا)

یعنی جو لوگ ہدایت پاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے علم اور عمل میں اضافہ فرماتا ہے۔

قرآن کے ظاہر سے اس کے باطن تک رسائی:

قرآن مجید کے بعض پہلو ظاہر ہیں۔ ان سے جب ہم رہنمائی حاصل کرتے ہیں تو اس باطن سے آگاہ ہوتے ہیں جو اس ظاہر کے پیچھے چھپا ہوتا ہے۔ اب وہ باطن ہمارے لیے ظاہر کے حکم میں ہو جاتا ہے۔ اگر ہم قرآن پر برابر غور و فکر کرتے رہیں تو قرآن فہمی میں ہم درجہ بدرجہ ترقی کرتے جاتے ہیں لیکن قرآن کے عجائب ختم نہیں ہوتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر ظاہر باطن کی تمہید ہوتا ہے۔ تدبر کرتے وقت ہم نہ کسی کلمہ کو اس کی جگہ سے ہٹاتے اور نہ قرآن کے معانی ظاہر کے خلاف کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک کے بعد دوسری نئی حقیقت روشنی میں آجاتی ہے۔ اس معاملہ کو یوں سمجھو جیسے ہم ایک شعر پڑھتے ہیں اور اس کے معنی سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس پر غور کرتے ہیں تو اس کے اندر صنعت اور بدیع کی بعض خوبیوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ مزید غور کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مضمون عین حق ہے اور کئی حکمتوں سے بڑھ کر نفع بخش ہے۔ شعر پر جتنا زیادہ غور کرتے ہیں تو نئی معلومات کی نوعیت یہ نہیں ہوتی کہ وہ ابتدائی مفہوم کے خلاف ہو جائیں بلکہ یہ علم پر اضافہ در اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہم نے شعر کا وہ مفہوم نہیں بدلا جو آغاز میں سمجھا تھا بلکہ شعر کے محاسن ہم پر واضح ہوئے۔

اب ایک دوسری مثال پر غور کرو۔ آپ دور سے نہایت متناسب تعمیر کا ایک محل دیکھتے ہیں تو اس کے قریب جاتے ہیں۔ جوں جوں آپ اس کے نزدیک ہوتے ہیں اس کی ترکیب اور نقوش کی خوبیاں آپ کے علم میں آتی ہیں۔ پھر آپ اس کے اندر داخل ہو جاتے ہیں تو وہاں ایسا ساز و سامان پاتے ہیں جس کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی اور آپ کا دل لذت پاتا ہے۔ اگر آپ کو اس محل میں ٹھہرنے کا موقع ملتا ہے تو آپ محسوس کرتے ہیں کہ اس کے کمروں کی ساخت ایسی ہے جس سے طبیعت کھلتی ہے اور گرمی سردی دونوں کی ضروریات کا

اس میں لحاظ رکھا گیا ہے- آپ اس میں سونے، آرام کرنے اور نہانے کے کمرے موجود پاتے ہیں- وہاں پاکیزہ مشغلوں کے لیے سروسامان موجود ہے، لذیذ کھانے اور شیریں و خوشگوار مشروب میسر ہیں- کچھ عرصہ وہاں قیام کے بعد کسی گوشے میں آپ کو ایک خفیہ دروازہ نظر آتا ہے اور اس کو کھولنے کی چابی ہاتھ آجاتی ہے- اس کو کھولتے ہی آپ ایک ایسے خزانے میں جا پہنچتے ہیں جس میں موتیوں، یاقوت اور قیمتی پتھروں کا کوئی شمار نہیں- اس کو پاکر آپ کے سرور و مسرت میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے- پھر اس خزانے کے ایک ایسے حصے میں آپ جا پہنچتے ہیں جس کو آج تک نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال ہی آیا- ٹھیک یہی صورت حال قرآن مجید پر غور و فکر کے دوران پیش آتی ہے اور اس پر تدبر کرنے والا برابر نئے نئے حقائق سے آگاہ ہوتا چلا جاتا ہے- یہ نئے حقائق قرآن کے ظاہر کے منافی نہیں ہوتے بلکہ علم میں اضافہ پر اضافہ ہوتے ہیں-(ر: ۵۵-۵٦)

ایک حقیقت دوسری حقیقت کی راہ کھولتی ہے :

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ قرآن کا باطن اس کے ظاہر کے نیچے چھپا ہوتا ہے تو یہ اس اعتبار سے ہے کہ ایک حق دوسرے حق کے ساتھ موافقت رکھتا ہے جبکہ باطل اس وقت زائل ہو جاتا ہے جب اس کے مقابل میں حق آجائے- اللہ تعالیٰ نے جس طرح تاریکی کو ختم کرنے کے لیے روشنی اور ہر عقدہ کا حل پیدا کر دیا ہے، اسی طرح ہر باطل کے مقابل میں اس نے حق کو بھی پیدا کیا ہے- اگر باطل پر حق کو غلبہ حاصل نہ ہو سکتا تو دونوں کا معاملہ یکساں ہو جاتا اور یہ ماننا پڑتا کہ معبود ایک نہیں دو ہیں بلکہ دو سے بھی زیادہ ہیں، کیونکہ باطل کی شکلیں لاتعداد ہیں- اس صورت میں دنیا ہر قسم کے نظم اور حکمت سے خالی ایک کھلونا قرار پاتی- مزید یہ ہوتا کہ چونکہ باطل اور باطل میں ٹکراؤ ہوتا ہے اس لیے دنیا فساد کا شکار ہو جاتی- پس دنیا کا وجود حق کی حکمرانی اور پائیداری کی دلیل ہے- مزید برآں یہ اس بلند و بالا حق کی دلیل ہے جو دنیا کے وجود کا آغاز تھا-

قرآن مجید نے یہ تمام حقیقت خود بیان کر دی ہے۔ فرمایا:

جاء الحق و زهق الباطل ان الباطل كان زهوقا۔(اسراء،۸۱)

(حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا اور باطل نابود ہونے والی چیز ہے)

اس دلیل کو دوسری جگہ زیادہ واضح کر دیا ہے فرمایا:

وما خلقنا السماء والارض و ما بينهما لعبين لو اردنا ان نتخذ لهوا لاتخذنه من لدنا ان كنا فعلين بل نقذف بالحق على الباطل فيدمغه فاذا هو زاهق ولكم الويل مما تصفون وله من فى السموات والارض و من عنده لا يستكبرون عن عبادته ولا يستحسرون يسبحون اليل والنهار لا يفترون ام اتخذوا الهة من الارض هم ينشرون لو كان فيهما الهة الا الله لفسدتا فسبحن الله رب العرش عما يصفون۔(انبیاء،۱۶-۲۲)

(اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشا کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھیل ہی بنانا چاہتے تو خاص اپنے پاس ہی بنا لیتے، اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے! بلکہ ہم حق کو باطل پر دے ماریں گے تو وہ اس کا بھیجا نکال دے گا تو دیکھو گے کہ وہ نابود ہو کے رہے گا اور تمہارے لیے اس چیز کے سبب سے جو تم بیان کرتے ہو بڑی خرابی ہے۔ اور اسی کے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی سے نہ سرتابی کرتے اور نہ تھکتے۔ وہ شب و روز اس کی تسبیح کرتے ہیں اور دم نہیں لیتے۔ کیا انہوں نے زمین کے الگ معبود ٹھہرا لیے ہیں، وہ زمین کو شاداب کرتے ہیں؟ اگر ان دونوں کے اندر اللہ کے سوا الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو کے رہ جاتے۔ تو اللہ عرش کا مالک، ان چیزوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں)۔

"کھیل خاص اپنے پاس ہی بنا لیتے" کا مفہوم یہ ہے کہ تمہیں مصیبت میں مبتلا نہ

کرتے، اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے، کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بات ماننا ہماری ذات کے حوالے سے بعید از فہم ہے۔ پھر اپنے مقرب ملائکہ کے بارے میں وضاحت کی ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں، ان میں کوئی الٰہ نہیں۔ وہ تو کھیل میں بھی دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔ یہی حال ان فرشتوں کا ہے جو زمین میں ہوتے ہیں۔ وہ زمین کو شاداب کرنے کا فرض انجام دیتے ہیں۔ الوہیت کے لیے وہ بھی موزوں نہیں۔ لہٰذا واحد متصرف ذات اللہ کی ذات ہے۔ اسی کے قبضہ میں آسمان و زمین کا مرکز حکومت ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ایک حقیقت کس طرح دوسری حقیقت کی راہ کھولتی جاتی ہے۔ باطل اور باطل میں ٹکراؤ کے برعکس حق کی تمام شکلیں ایک دوسرے سے موافقت رکھتی ہیں اس لیے جب ایک حق آدمی پر منکشف ہوتا ہے تو وہ اس کی پہلے سے معلوم حقیقتوں کے ساتھ ایک نئی مناسبت کو منظر عام پر لاتا ہے۔ دنیاوی علوم میں بھی یہ امر مشاہدہ میں آتا ہے کہ علم میں نیا اضافہ پہلے سے موجود علم میں کئی پہلوؤں سے اضافہ کر دیتا ہے، کیونکہ ایک حقیقت بہت ساری حقیقتوں کو روشنی میں لانے کا باعث ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء چھوٹی سے چھوٹی حقیقت جاننے کے لیے بھی بے تاب ہوتے ہیں کیونکہ کوئی حقیقت اصل میں چھوٹی نہیں ہوتی بلکہ وہ جن نئی حقیقتوں کا دروازہ کھول دیتی ہے ان کی عظمت کے باعث یہ خود عظیم ہوتی ہے۔

قرآن کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جب جب اس کے علم میں تم اضافہ کرو گے یہ اس کے معانی پر سے پردہ اٹھا دے گا۔ کسی شخص کے لیے یہ روا نہیں کہ جب تک حق ثابت نہیں ہوا اور شک کا پردہ باقی ہے وہ قرآن کی کوئی تاویل بیان کرے۔ کیونکہ جو چیز حق نہیں ہوتی اس کا تار و پود خود ہی بکھر جایا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے نفسانی اوہام اور سروں میں سمائے ہوئے سودا کے مطابق قرآن کی تفسیر کی ان کی حماقتیں ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ لہٰذا یہ امر واجب ہے کہ آدمی قرآن کی واضح و محکم آیات کو اور مشہور ذخیرۂ خبر میں سے

جو کچھ ثابت ہو اس کو مضبوطی سے پکڑ لے۔اسی طرح ہر حق کو، جس کا انکشاف ہو، مضبوطی سے پکڑنا ضروری ہے، یہاں تک کہ اس حق کو بھی جو کسی دوسرے علم کے ذریعہ سے آئے۔ صرف اس حق کو لینا کافی نہیں جس کو لوگ ذہنی تیاری کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ بطور رہنما کام آئے گا۔اس کی حیثیت محض ایک رائے اور اندازہ کی ہوتی ہے۔اصل علم تو خدائے خبیر کی طرف سے آتا ہے۔

یہیں سے پختہ کار علماء کی علم کے بارے میں احتیاط سمجھ میں آتی ہے۔وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے بلکہ صرف اس بات پر اعتماد کرتے ہیں جو روشن ہوتی ہے۔ایک مقلد جس کی آنکھیں باطل کی چمک سے چندھیا گئی ہوں جہاں مشکل میں پڑ جاتا ہے وہاں یہ علماء رک جاتے ہیں اور لا اعلم (میں نہیں جانتا) کہنے کی طرف ان کی میلان زیادہ ہوتا ہے۔میں نے حضرت ابوبکرؓ کا یہ قول سنا ہے کہ ای ارض تقلنی و ای سماء تظلنی ان قلت بما لا اعلم (اگر میں اس چیز کے بارے میں کلام کروں جس کا علم نہیں رکھتا تو کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا) اسی طرح امام مالکؒ کا قول ہے عندی من لا ادری مالو کان مثله عند احدکم من الابل کان غنیا (میرے پاس 'میں نہیں جانتا' کا اتنا ذخیرہ ہے کہ تم میں سے کسی کے پاس اتنے اونٹ ہوں تو وہ غنی ہو جائے) محض رائے یا جھوٹے اندازے پر مبنی بات کرنے سے جب آدمی کنارہ کش ہو جائے تو پھر جو کچھ باقی رہتا ہے وہ واضح اور ثابت حق ہوتا ہے۔(ر : ۵۷-۵۹)

قرآن فہمی کے لیے ہر علم صحیح کا حصول مفید ہے :

جب تم یہ بات جان چکے کہ ہر نیا حق قرآن کے معانی کا ایک نیا پہلو واضح کرتا ہے جو ان ثابت حقیقتوں کا اثبات، تائید اور وضاحت کرتا ہے جو پہلے سے تمہارے پاس ہوتی ہیں، تو قرآن کے فہم ہی کی خاطر یہ لازم ہوا کہ آدمی ہر علم صحیح کو حاصل کرے۔ہمارے نبی مصطفیٰ ﷺ نے جب فرمایا کہ الحکمة ضالة المومن (حکمت مومن کی ایک گم شدہ

متاع ہے) تو آپ نے اسی چیز کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی تھی- اسی سبب سے صحابہ کرامؓ علم حاصل کرنے کے بڑے حریص تھے- وہ جو کچھ نہیں جانتے تھے اس کے بارے میں برابر سوال کرتے اور جواب سنتے- اللہ تعالیٰ نے نعمتیں اپنی مخلوق میں بانٹ دی ہیں تاکہ وہ سب ایک دوسرے سے ملیں اور باہم تعاون کریں- لہٰذا اگر تمہارے پاس ایک قیمتی موتی ہو تو اس پر اترانے کا فائدہ؟ اللہ تعالیٰ کے پاس اس سے کہیں زیادہ بیش قیمت موتی معلوم نہیں کتنی تعداد میں ہوں گے- اسی لیے قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وفوق کل ذی علم علیم -(یوسف:۷۶)

(اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے)

حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے واقعات میں اس بارے میں نہایت دل نشین سبق موجود ہے[1] پس کوئی شخص خواہ وہ خود ہی نبی ہو، علم حاصل کرنے سے بالا نہیں ہوتا اور سوال کرنے سے قدر و منزلت میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اضافہ ہوتا ہے- تمہارا یہ کہنا روا نہ ہوگا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں، قرآن میرے لیے کافی ہے- قرآن یقیناً کافی ہے لیکن وہ اسی طرح کافی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کافی ہے- کیا تمہیں اس سے مانگنے اور جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جبکہ انسان تو وہی کچھ پاتا ہے جس کے لیے وہ جدوجہد کرتا ہے- کیا سورج کی روشنی تمہارے لیے کافی نہیں ہوتی لیکن اس کے کافی ہونے کے لیے یہ بھی تو ضروری ہوتا ہے کہ تم تاریکیوں اور پردوں میں سے نکل کر باہر آجاؤ- ہر لا علمی ایک پردہ ہوتا ہے اور ہر حق روشنی- روشنی کو حاصل کرنے کے لیے ہمہ وقت آمادگی لازم ہے-(ر:۵۹)

قرآن پر تدبر واجب ہے:

قرآن مجید میں تدبر و تفکر کے واجب ہونے کی متعدد دلیلیں بیان ہوئی ہیں- مثلاً:

الف- قرآن نے متعدد آیات میں صراحت کے ساتھ اس کا حکم دیا ہے-

ب- قرآن کی بعض آیات میں تدبر، استدلال اور غور و فکر کے مواقع کی نشان دہی کر دی گئی ہے- مگر تدبر کے بعد ان سے جو حقیقت کھلتی ہے ان کو بیان نہیں کیا گیا بلکہ اس کو قاری کے فہم پر چھوڑ دیا ہے-

ج- نبی ﷺ جس طرح احکام شریعت کی تعلیم دینے پر مامور تھے اسی طرح حکمت کی تعلیم بھی آپ کی ذمہ داری تھی- چنانچہ آنحضرتؐ نے اس کی تعلیم دی، اس کا شوق دلایا اور حکمت کی راہوں کی طرف رہنمائی دی- آپ کا دستور یہ تھا کہ کبھی کبھی صحابہ کرامؓ کے سامنے کوئی مسئلہ پیش فرما دیتے تاکہ وہ خود اس سے کوئی نتیجہ اخذ کریں- مثلاً صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ :

"نبی ﷺ نے لوگوں سے پوچھا کہ درختوں میں وہ کون سا درخت ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور وہ مسلمان سے مشابہت رکھتا ہے- لوگ صحرا کے درختوں کا سوچنے لگے- عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میرے دل میں کھجور کے درخت کا خیال گزرا- پھر لوگوں نے عرض کی "یارسول اللہ! آپ ہی ارشاد فرمائیں"- حضورؐ نے فرمایا "یہ کھجور کا درخت ہے"-

حضور ﷺ نے سوال کرنے سے بھی منع فرمایا تھا- منع سوال کا مقصد دوسرے مصالح کے علاوہ یہ تھا کہ لوگ خود بھی عقل اور سمجھ کو استعمال کریں- صحیح بخاری باب العلم میں حضرت ثابت بن انس سے روایت ہے کہ :

"ہمیں قرآن میں نبی ﷺ سے سوال کرنے سے روکا گیا تو ہمیں اس بات سے خوشی ہوتی کہ دیہاتیوں میں سے کوئی عقل مند آدمی آکر حضورؐ سے سوال کرے جبکہ ہم سن رہے ہوں"-

یہاں حضرت ثابتؓ کا منع سوال سے اشارہ آیت یایھا الذین امنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبدلکم تسؤکم (مائدہ :۱۰۱)(اے ایمان والو، ان چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو جو اگر تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں) کی

طرف ہے- اور "عقل مند آدمی" کہنے سے ان کی مراد شاید یہ ہے کہ وہ کسی اہم اور مفید معاملہ میں سوال کرتا-

صحابہؓ کا طریقہ یہ تھا کہ اپنی مجلسوں میں قرآن مجید کے معانی کے بارے میں سوال کرتے اور ان پر سوچا کرتے تھے- حضرت عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ لوگوں سے پوچھا کہ سورۃ النصر میں کس بات کا اشارہ ہے- مجلس میں جتنے بوے لوگ تھے ان میں سے کوئی اس سوال کا جواب نہ دے سکا- حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اپنی رائے ظاہر کی جس کی حضرت عمرؓ نے تصدیق کی- ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن عباسؓ کے اندر فہم قرآن اور تفقہ فی الدین کا شوق دیکھا تو ان پر زیادہ عنایت کرنے لگے-

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید سے استفادہ کا دارومدار اس کے سمجھنے پر ہے- یہ کام بڑا غور و فکر چاہتا ہے- اللہ تعالٰی نے متعدد آیات میں اپنی کتاب میں تفکر کو واجب ٹھہرایا اور نبی ﷺ نے اس کی نہ صرف ترغیب دی بلکہ اس میں بحث اور استنباط مسائل کے طریقہ کی تعلیم بھی دی اور یہ چیز آپ کے فرائض میں شامل تھی- لیکن ہمارے یہاں لوگوں نے جب آیات اللہ میں غور و فکر ترک کر دیا تو سنت کو بدعت اور بدعت کو سنت قرار دینے لگ گئے- یہ حقیقت کتنی تکلیف دہ ہے کہ خود اہل حق کے ہاں حق اور باطل مشتبہ ہو جائیں اور ان کے اندر حق کی جائے باطل کی عصبیت پیدا ہو جائے- (ر: ۲۱۸-۲۲۰)

قرآن مجید کی ترتیب

جہاں تک قرآن مجید کی تدوین کے اس مفہوم کا تعلق ہے کہ اس کی آیات کی ترتیب وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھی تو اس میں کسی کو شک نہیں۔ شک اگر کرتے ہیں تو وہی لوگ کرتے ہیں جو تاریخ سے بے بہرہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام سورتیں عہد نبوی میں نمازوں میں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگ خود بھی ان کو پڑھتے اور نبی ﷺ کی زبان سے بھی ان کو سنتے۔ اس بارے میں روایات تواتر کی حد کو پہنچی ہوئی ہیں۔

جو لوگ تدوین قرآن کے بارے میں شک کرتے ہیں، انہیں اصل شک سورتوں کی ترتیب میں ہے، آیات کی ترتیب میں نہیں ہے۔ ان کے پیش نظر یہ سوال ہے کہ آیا سورتوں کی ترتیب قرآن کو جمع کرنے والے صحابہ نے قائم کی یا عہد نبوی میں بھی یہ اسی طرح تھی۔ اس میں صحیح و ثابت بات یہ ہے کہ سورتوں کی ترتیب من جانب اللہ ہے۔ جبریلؑ نے نبی ﷺ کو اس کی تعلیم دی اور حضور نے اس کو صحابہ تک پہنچایا۔ عہد نبوت میں قرآن مجید مرتب ہو چکا تھا۔ اس کی ہر ہر سورت، ایک ایک آیت اور الفاظ تک اپنے ٹھیک موقع و محل میں رکھے جا چکے تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جو کچھ ہوا وہ یہی تھا کہ قرآن مجید کو اس ترتیب پر ایک مصحف میں جمع کر دیا گیا کیونکہ اس سے قبل یہ حفاظ کے سینوں میں جمع تھا اور اس کے صرف بعض اجزاء لکھے ہوئے تھے۔ لہذا اصحابؓ نے حفاظ سے اس کو نقل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ انہوں نے مصحف میں لکھنے کے لیے دو یا دو سے زیادہ شہادتوں کا اہتمام کیا، خواہ وہ حفظ کی شہادت ہو یا کتابت کی۔ حضرت عمرؓ کے گواہی لینے کا جو ذکر روایات میں آتا ہے وہ یہ گواہی نہیں تھی کہ فلاں آیت قرآن کی ہے یا نہیں، کیونکہ صحابہؓ قرآن کے اسلوب کو جانتے پہچانتے تھے اور اس کو دوسرے کلام سے امتیاز کرتے تھے۔

لہذا حضرت عمرؓ آیات کے محل و مقام کے بارے میں شہادت لیتے۔

پس ہم ایک اصول موضوعہ کے طور پر مانتے ہیں کہ قرآن کی ترتیب آیات و سور ٹھیک اسی طرح محفوظ ہے جیسی حضرت جبریل امینؑ لائے تھے۔ اس میں کوئی تقدیم و تاخیر نہیں ہوئی۔ آیت ان علینا جمعه و قرآنه (قیامہ : ۱۷) (ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا) کا تقاضا یہی تھا۔ یہ ترتیب تواتر سے ہم تک پہنچی ہے۔ لہذا ہمیں اس ترتیب کو ثابت نہیں کرنا ہے بلکہ اس کی مدد سے دوسری باتوں کو ثابت کرنا ہے۔ (ر : ۲۵)

قرآنی ترتیب کی خصوصیات :

قرآن کی تدوین و ترتیب میں یہ بات نظر آتی ہے کہ اس کی موجودہ ترتیب نزول کی ترتیب کے برعکس ہے۔ اکثر سورتیں جو ابتداء میں نازل ہوئیں ان کو قرآن کے آخر میں جگہ دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن قرأت اور درس کے لیے ہے۔ نزول قرآن کی تکمیل کے زمانے میں پڑھنے والوں کے لیے قرآنی ترتیب کا ابتدائی حصہ ان کے اس وقت کے حالات کے زیادہ قریب تھا۔ اگر وہ اس کو نزولی ترتیب کے ساتھ پڑھتے تو اپنے سامنے کے حالات سے بہت دور ہو جاتے اور ایک ایسی چیز سے آغاز کرتے جو ان کے زمانہ سے بعید ترین تھی۔ اس کو یوں سمجھو کہ آدمی جب ایک سیڑھی کے ذریعے اس کے اوپر کے سرے پر پہنچ جانے کے بعد واپس اس کے نچلے سرے تک پہنچنا چاہتا ہے تو اب وہ سیڑھی کے شروع کے نچلے زینوں سے آغاز نہیں کرتا بلکہ اوپر کے زینوں سے درجہ بدرجہ نیچے اترتا ہے۔ سیڑھی پر چڑھنا اور اترنا ایک دائروی حرکت ہے جس میں کہیں رابطہ منقطع نہیں ہوتا اور ایک سرے سے دوسرے سرے کو جانا سہل ہوتا ہے۔ یہی آسان طریقہ ہے۔

کلام عرب میں بھی ترتیب کی نوعیت یہی ہے۔ جہاں لف و نشر کا موقع ہوتا ہے وہاں عرب درجہ بدرجہ آخر سے اول کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس کے علاوہ کلام میں جہاں بھی دو ترتیبیں جمع ہو رہی ہوں وہاں لف و نشر کا موقع نہ بھی ہو تب بھی اس کا طریقہ یہی ہوتا ہے۔

منطق میں بھی اہل عرب کا طریقہ یہی ہے۔ منطق کی شکلوں میں سب سے پہلی شکل جو سب سے سہل ہے اسی ترتیب پر ہے۔ اس ترتیب کی نہایت عمدہ مثال سورہ الغاشیہ کی آیات ۱۷ تا ۲۰ میں ملتی ہے۔ فرمایا:

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت

(کیا وہ اونٹوں پر نگاہ نہیں کرتے کہ وہ کیسے بنائے گئے)

بات اونٹ سے شروع کی جو مخاطب سے قریب ترین اور بالکل سامنے کی چیز تھی۔ پھر فرمایا:

و الی السماء کیف رفعت (اور آسمان کو نہیں دیکھتے کیسا اونچا کیا گیا)

یہ گویا سامنے سے نگاہ کو اوپر کی جانب اٹھایا۔ پھر آسمان سے اترتے ہوئے واپس لوٹے۔ آگے فرمایا:

و الی الجبال کیف نصبت و الی الارض کیف سطحت

(اور پہاڑوں پر نظر نہیں ڈالتے کس طرح کھڑے کیے گئے اور زمین کو نہیں دیکھتے کس طرح بچھائی گئی)

جس طرح درجہ بدرجہ نگاہ کو اونٹ سے آسمان کی طرف بلند کیا تھا اسی طرح درجہ بدرجہ اس کو نیچے کی طرف لائے اور آسمان سے پہاڑوں کی طرف اور پہاڑوں سے میدانوں کی طرف لوٹے۔

غیر مسلموں کو قرآن مجید کی ترتیب مشکل معلوم ہوتی ہے۔ ان کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ اگر وہ چاہیں تو قرآن کو اس کے آخر سے پڑھنا شروع کریں اور اس کی ابتداء کی طرف آئیں۔ اس طرح وہ صدر اول کے مسلمانوں کا سا عمل کریں گے۔

نزول قرآن کے زمانہ میں مسلمانوں کے حالات قرآن کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے۔ جیسے جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا اور اپنے کلام کے ذریعے تعلیم دی وہ اپنے آپ کو ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتے گئے، یہاں تک کہ وحی کا سلسلہ تمام ہونے پر ان کی

تربیت بھی مکمل ہو گئی- قرآن مجید ان مسلمانوں کے احوال کا ایک آئینہ ہے-اس میں ان کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہو اور وہ سختیاں، مشکلات، مجاہدے اور جنگی کشمکش بھی نظر آتی ہے جس میں سے وہ گزرے- یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حق کے کلمہ کو سربلند کیا اور اس کا نور چاروں طرف پھیلا دیا-

نزول قرآن کی تکمیل کے بعد قرآن کو منظم شکل میں اہل ایمان کے حوالے کیا گیا-اس نئی ترتیب میں وہ حاضر سے ماضی کی طرف جاتے اور یہ جانتے کہ وہ پہلے کس حال میں تھے- یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنے زمانے سے لے کر ماضی بعید کے زمانے تک کی تاریخ پڑھتا جائے- قرآن کی نزولی ترتیب ان لوگوں کے سامنے آئی جو مومن نہیں تھے- اس میں سفر حال سے مستقبل کو تھا-ان دونوں ترتیبوں میں الاقرب فالاقرب کا اصول ملحوظ تھا-(ر:۹۶-۹۸)

اگرچہ کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے زیادہ سورتوں کے نزول کے صحیح مقامات سے واقف نہ تھا لیکن انہوں نے ترتیب نزول کا کبھی لحاظ نہیں رکھا-انہوں نے اگر اس کا کہیں ذکر کیا بھی تو صرف وضاحت کے لیے یا تفسیر میں، ورنہ اس کو انہوں نے کوئی اہمیت نہ دی-

ترتیب نزولی کی حکمتیں:

قرآن حقیقت میں یاددہانی کے لیے ہے-اس کا مقصد دلوں کو رب کی طرف مائل کرنا ہے-ابتدائی دور کے مخاطب بعد والوں کی مانند نہیں تھے-ان کے دل حق بات سن کر تنگ ہوتے تھے اور بچی بات سن کر وہ بیزار ہوتے تھے-لہٰذا ابتدائی دور میں جو کلام نازل ہوا اس میں

- ✩ توحید اور قیامت جیسے واضح ترین حق کو پیش کیا گیا-
- ✩ کلام نہایت مختصر ہوتا-
- ✩ کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے قسم اور قیامت و عذاب کی تصویر کشی کی گئی-

- ☆ عبارت طویل نہ تھی تاکہ یاد کرنا آسان ہو۔
- ☆ فقروں میں سجع کا انداز تھا کیونکہ لوگوں کو اس سے دلچسپی تھی۔
- ☆ نظام سادہ تھا تاکہ مقصد بالکل واضح ہو جائے۔

جب حق واضح ہو کر پھیل گیا، سینے ایمان کے لیے کھل گئے، دل نرم ہو گئے اور لوگ تدبر پر آمادہ ہو گئے، نبی کی صحبت اور گفتگوؤں نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا تب قرآن ان لوگوں کو علم اور بصیرت کی بلندیوں تک لے گیا۔

نزول قرآن کے لحاظ سے قرآن کے مطالب کی ترتیب یوں ہے کہ :

- ☆ آغاز میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تلاوت قرآن اور سری و جہری نمازوں کا حکم دیا تاکہ ان میں قوت اور ثابت قدمی پیدا ہو اور واضح دعوت کے بغیر بھی لوگوں کو ان کا پیغام سنائی دے۔
- ☆ اس کے بعد وہ مرحلہ آیا جس میں آپ کو دعوت دینے، مومنین کو خوشخبری سنانے اور کفار کو خبردار کرنے کی ہدایت ہوئی۔ آپ نے شرک اور ہوائے نفس کی پیروی کی برائی بیان کی اور تقویٰ اور خدا کی طرف رجوع پر زور دیا۔ آپ نے جود و کرم، حلم، حکمت جیسی خوبیوں کو اپنانے کی تلقین فرمائی، یہاں تک کہ عقل مند لوگوں نے آپ کی دعوت پر یقین کر لیا اور ان کے دل اس کی طرف مائل ہو گئے۔ لیکن یہ حال صرف ان لوگوں کا تھا جنہوں نے آپ کی دعوت کو غور سے سنا اور سمجھا۔ بہت سے لوگوں نے تکبر کی راہ اختیار کی اور دعوت کا انکار کیا۔ ایسے لوگوں کو ایک مدت تک مہلت دی گئی اور نبی ﷺ نے مومنین پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔
- ☆ تیسرے مرحلہ میں آپ کی طرف شریعت اور احکام نازل ہوئے۔ ان کا نزول وعظ و نصیحت اور ترغیب و ترہیب کے درمیان ہوا۔

نزول قرآن کے آغاز میں عام اخلاق انسانی کو پیش نظر رکھا گیا جبکہ بعد میں سامنے کی اقوام مد نظر تھیں۔ لہذا قرآن کا ابتدائی حصہ امور کلی سے بحث کرتا ہے اور آخری حصہ جزوی امور سے۔ پہلا حصہ عقل سے زیادہ قریب ہے جبکہ آخری حصہ حواس سے زیادہ قریب ہے۔ پہلا حصہ محدود لیکن گہرا ہے ، آخری حصہ پھیلا ہوا اور عام فہم ہے۔ (ر:۹۷-۹۸)

سورتوں کی مقدار :

سورتوں کی ترتیب ان کی مقدار کے اعتبار سے نہیں ہے۔ سورہ فاتحہ سورہ بقرہ کے چالیسویں حصہ کے بقدر ہے۔ سورہ ابراہیم سورہ نحل سے پہلے آتی ہے لیکن مقدار میں اس کے نصف سے بھی کم ہے۔ سورہ فرقان سورہ شعراء سے پہلے ہے لیکن یہ اس کا ایک تہائی ہے۔ سورہ الم السجدہ سورہ الاحزاب سے متصلاً پہلے ہے لیکن اس کے نصف کے بقدر ہے۔ اسی طرح متعدد چھوٹی سورتیں دیکھو گے جو ترتیب میں طویل سورتوں سے پہلے رکھی گئی ہیں۔

فی الجملہ دیکھا جائے تو چھوٹی سورتیں قرآن مجید کے آخر میں رکھی گئی ہیں اور یہ نہایت لذیذ و شیریں اور آسان و روشن ہیں۔ ایک قاری ان تک پہنچنے کا اسی طرح انتظار کرتا ہے جس طرح ایک مسافر جو کسی سرسبز و شاداب اور پر رونق منزل تک پہنچنے کا منتظر ہوتا ہے۔ قرآن پڑھنے والے کی مثال یوں ہے جیسے ایک آدمی زمین سے آسمان کی طرف چڑھ رہا ہو۔ جوں جوں وہ قرآن کے آخر میں پہنچتا ہے تو وہ دین کے اصول اور اعلیٰ امور سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ (ر:۹۸)

چھوٹی سورتوں کی حکمتیں :

قرآن مجید کی چھوٹی سورتیں اپنی عظمت، اپنی حکمت اور اپنے نظم کے اعتبار سے بڑی سورتوں کی ہمسری کرتی ہیں۔ ہمارے قدیم علماء نے بھی بعض چھوٹی سورتوں کی نسبت کہا ہے کہ "یہ تہائی قرآن کے برابر ہیں" یا بعض کی نسبت کہا ہے کہ "یہ پوری کرنے والی

ہیں"۔ مثلاً سفیان بن عیینہؒ سے روایت ہے کہ سورہ فاتحہ نماز کو پوری کرنے والی ہے کیونکہ یہ علم کو پورا کرنے والی ہے۔ حضرت امام شافعیؒ سے روایت ہے کہ اگر صرف سورہ العصر ہی نازل ہوتی تو بھی کافی تھی۔ جو لوگ غور کرنے والے ہیں وہ کم از کم خاص خاص سورتوں کے بارہ میں تو اس حقیقت کے اعتراف سے انکار نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر قرآن کی تمام سورتوں پر اچھی طرح غور کیا جائے تو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو سورتیں اپنی قامت کے اعتبار سے جتنی ہی چھوٹی ہیں معنی کے اعتبار سے اتنی ہی بڑی ہیں۔ ان کے چھوٹے سے حجم کے اندر اسرار حکمت کے اتنے خزانے بند ہیں کہ اگر وہ کھول دیے جائیں تو دفاتر کے اندر بھی نہ سمائیں۔

چھوٹی چھوٹی سورتوں کے اندر وسیع معانی بند کر دینے کا یہ اسلوب قرآن مجید نے مندرجہ ذیل وجوہ سے اختیار فرمایا۔

۱۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ دین کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے اصول ہمیشہ ذہنوں کے سامنے مستحضر رہیں۔ یہ چیز چاہتی ہے کہ ان اصولوں کو نہایت مختصر کلمات اور جچے تلے الفاظ کے اندر گرہ کیا جائے کہ وہ امثال کی طرح زبان پر چڑھ جائیں تاکہ ذہن و دماغ کے لیے وہ جتنے ہی بھاری اور وزنی ہوں زبان کے لیے اتنے ہی ہلکے پھلکے ہوں۔ اس طرح کی باتوں کو اگر طویل عبارتوں میں بیان کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ ان کے پھیلاؤ کے اندر گم ہو کے رہ جائیں۔

۲۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ عموماً کسی تعلیم و دعوت کی ابتداء میں اس کے لیے لوگوں کے دل اچھی طرح نہیں کھلتے جس کے سبب سے نہ تو تفصیلات کلام کے لیے ان کے اندر گنجائش ہوتی ہے نہ جزئیات احکام کے لیے۔ اس وجہ سے ابتدا میں لوگوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ جوامع الکلم یعنی چھوٹے چھوٹے پر حکمت فقروں اور جملوں میں دی جاتی ہے۔ جوامع الکلم کے یہ بیج جب پھوٹتے ہیں تو تفصیلات سے ان کی آبیاری کی جاتی ہے اور اس طرح

آہستہ آہستہ دل کی وسعت اور اس کے علم دونوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

۳۔ اہل عرب جس طرح مسجع اور مقفیٰ کلام کے بڑے دلدادہ تھے اسی طرح وہ کلام میں ایجاز و اختصار کو بھی بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔اس وجہ سے پہلے اسی اسلوب کلام میں ان کو دعوت دی گئی جس کو وہ پسند کرتے تھے تاکہ یہ کلام ان کو اپیل کر سکے۔

۴۔ عرب کے کاہنوں کا کلام ایجاز اور سجع دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔اس طرز کلام کے اہل عرب بڑے گرویدہ تھے اور اس کو غیبی کلام کی ایک ضروری خصوصیت خیال کرتے تھے۔یہ مناسبت بھی مقتضی ہوئی کہ قرآن مجید بھی یہی روش اختیار کرے تاکہ وہ اس سے بیگانگی نہ محسوس کریں۔(م: ۵۳-۵۴)

مختصر سورتوں کی ایک خاص حکمت :

سورۃ العصر، سورۃ الکوثر اور سورۃ الاخلاص یا انہی کے بقدر مختصر و مجمل سورتوں کی مقدار کم رکھنے میں ایک اور بڑی حکمت بھی ملحوظ ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔یہ حفاظت خود اس دین کی حفاظت کے لیے مطلوب ہے جس کو رب نے کامل کیا اور جس پر ہدایت آسمانی کا سلسلہ ختم کیا۔یہ محض قرآن کے کتاب اللہ ہونے کے باعث مطلوب نہیں تھی کیونکہ آخر پہلی تمام آسمانی کتابیں بھی تو کتاب اللہ ہی تھیں اور وہ جن پر نازل ہوئیں وہ سب کے سب اللہ کے نبی ہی تھے لیکن لوگوں نے ان کے بعد ان کتابوں میں تبدیلیاں کر لیں یہاں تک کہ قرآن کسوٹی بن کر نازل ہوا۔

چونکہ دین کامل کو باقی رکھنا مقصود تھا اس لیے جامع و کلی اصول دین کو غایت درجہ اختصار اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا تاکہ اگر امت کا ہر فرد بتمام و کمال قرآن شریف کو حفظ کرنے پر قادر نہ ہو سکے تو اس کو ان چھوٹی سورتوں کو حفظ کرنا مشکل نہ محسوس ہو۔اسی لیے تم دیکھو گے کہ یہ چھوٹی سورتیں مشتمل بھی ایک ہی مخصوص مضمون پر ہیں۔سورہ اخلاص توحید کی سورہ ہے جس میں توحید کا مضمون غایت درجہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

تورات اور انجیل میں یہ مضمون تو آیا لیکن اتنی وضاحت سے نہیں جس وضاحت کے ساتھ قرآن میں آیا ہے۔ سورہ العصر دین کی دو بنیادوں "ایمان اور اعمال صالحہ" پر اور سورہ الکوثر عبادت کے مضمون پر مشتمل ہے۔ سورہ الزلزال میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ دینونت مکمل طور پر انصاف کے ساتھ ہو گی اور اس میں رب کی رحمت کا لحاظ بھی ہو گا۔ اسی حقیقت کے پیش نظر ان چھوٹی سورتوں کو حفظ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان میں سے بعض کا ایک تہائی قرآن اور بعض کا نصف قرآن کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔(ر: ۹۴-۹۵)

پاروں کی تقسیم:

تم اس بات سے ناواقف نہ ہو گے کہ قرآن مجید کی تقسیم رکوع اور تیس پاروں میں بعد کی چیز ہے، اور اگر غور کرو گے تو معلوم ہو گا کہ رکوع کا مقصد فصل ہے۔ جن لوگوں نے رکوع ٹھہرائے ہیں انہوں نے مفاصل کلام کا لحاظ کر کے ان کی جگہیں متعین کر دی ہیں۔ ان کے سامنے یہ چیز تھی کہ قاری ایسی جگہ قطع کلام نہ کر دے جہاں وصل ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لحاظ سے ان کے اندازے کسی قدر صحیح ہیں۔ لیکن ترتیب کے علم کی ضرورت ہنوز باقی ہے کیونکہ رکوع کی تقسیم صرف فصل کا پتہ دیتی ہے۔ حالانکہ فصل کے ساتھ وصل بھی ہوتا ہے۔ رکوع کے ساتھ کلام یک قلم منقطع نہیں ہو جایا کرتا۔ رکوع سورہ کے تمام اجزاء کو ایک درجہ پر کر دیتا ہے، حالانکہ بسا اوقات ایک بات دوسری بات کے تحت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کتابوں کو حصوں، پھر ابواب، پھر فصلوں، پھر فقرات میں تقسیم کرتے ہیں۔ رکوع سے صرف فصل ظاہر ہوتا ہے۔ پس رکوعی تقسیم نے مفید ہونے کے باوجود نظم کے بیان کی ضرورت اور زیادہ واضح کر دی ہے۔ تعیین رکوع سے پہلے کلام بالکل متصل نظر آتا تھا جس کی وجہ سے وہ لوگ جو غور کے عادی تھے وجوہ اتصال کا بھی پتہ لگا لیتے تھے۔ لیکن رکوع ٹھہرا دینے کے بعد قاری کو یہ گمان ہوتا ہے کہ یہاں بات بالکل ختم ہو گئی ہے۔ اس لیے ایسی تقسیم کی ضرورت ہے جو ربط و انقطاع اور وصل و فصل دونوں کو ظاہر کرے۔

تیس پاروں کی تقسیم بالکل مقداری تقسیم ہے اور بعض اوقات اس سے بھی قطع کلام کا گمان ہوتا ہے- میں اس کے ترک کو پسند کرتا ہوں- میرے خیال میں منازل کی تقسیم کافی ہے- یہ تقسیم سورتوں کے اجزاء کی قطع وبرید بھی نہیں کرتی-

اوپر میں نے یہ جو کہا ہے کہ جن لوگوں نے سورتوں کو رکوعوں میں تقسیم کیا ہے ان کے اندازے کسی قدر صحیح ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اندازے ہر جگہ صحیح نہیں ہیں- انہوں نے بہت سے مفاصل چھوڑ دیے ہیں- مثلاً سورہ القمر کو بلا لحاظ اسلوب کلام و مقدار تین رکوع میں تقسیم کر دیا گیا ہے حالانکہ اس کو چھ رکوع میں تقسیم کرنا تھا- یعنی اس طرح:

۱- اقتربت الساعة

۲- كذبت قبلهم قوم نوح

۳- كذبت عاد فكيف كان عذابى و نذر

۴- كذبت ثمود بالنذر

۵- كذبت قوم لوط بالنذر

۶- ولقد جاء ال فرعون النذر

اس کام میں مدد خود قرآن مجید کے لفظی و معنوی اشارات سے مل سکتی ہے- لفظی اشارات کے لیے دلیل راہ سورتوں کے اوائل کے اسالیب ہیں- مثلاً يا ايها الذين - يا ايها الناس - الم تر - ارأيت - قل وغیرہ اور واضعین رکوع نے اسی سے مدد لی بھی ہے- اسی طریقہ سے قافیہ کی تبدیلی، آیات کی مقدار، اسلوب کی یکسانی اور عبارت کی ہم رنگی بھی ان کے سامنے رہی ہے- (م: ۵۸-۵۹)

قرآن-ایک مربوط و منظم کتاب

اوپر کے مباحث سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ قرآن کی ترتیب آیت آیت اور سورہ سورہ کے لحاظ سے ٹھیک وہی ہے جسے جبریل امینؑ لے کر آئے تھے-اس میں کسی چیز کو آگے یا پیچھے نہیں کیا گیا اور اس ترتیب کے محفوظ ہونے میں ہمیں مطلقاً کوئی شک نہیں-رہی یہ بات کہ کیا یہ ترتیب ہر پہلو سے ایک بہترین ترتیب ہے یا منتشر آیات کا ایک مجموعہ، جس میں باہمی ربط و نظم کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا، تو یہ سوال قابل بحث ہے-

قرآن کے نظم و ربط کے بارے میں دو رائیں :

علماء کی ایک جماعت نظم قرآن کی قائل رہی ہے اور اس کو سمجھنے کی راہ میں اس نے کوششیں کی ہیں-علامہ سیوطیؒ اتقان میں لکھتے ہیں :

> "ابو حیان کے شیخ علامہ ابو جعفر بن زبیر نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب تالیف کی ہے-اس کا نام البرهان فی مناسبۃ سور القرآن ہے- ہمارے ہم عصروں میں سے شیخ برہان الدین بقاعی نے بھی اپنی کتاب نظم الدرر فی تناسب الآی والسور میں نظم کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے"-

اس کے بعد علامہ سیوطی نے خود اپنی کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جس میں سورتوں اور آیتوں کی مناسبت کے علاوہ اعجاز قرآن کے مختلف پہلو بھی انہوں نے بیان کیے ہیں-اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں :-

> "نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے-اس کے اشکال کی وجہ سے علماء نے

اس سے بہت کم صرف کی ہے۔ امام فخر الدین رازی تنہا شخص ہیں جنہوں نے اس کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآنی حکمت کا بڑا حصہ ترتیب و نظم کے اندر چھپا ہوا ہے"۔

خود مجھے امام رازی کی تفسیر کبیر میں، آیت ولو جعلناہ قرآنا اعجمیا (حم السجدہ: ۴۴) کے تحت نظم قرآن سے متعلق ان کا مندرجہ ذیل بیان ملا :-

"اس آیت کے شان نزول کے بارہ میں یہ روایت ہے کہ کفار نے ازراہ شرارت کہا کہ قرآن مجید کسی عجمی زبان میں کیوں نہیں نازل کیا گیا تو یہ آیت اتری۔ میرے نزدیک اس طرح کی باتوں سے قرآن مجید پر سخت اعتراض لازم آتا ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن میں ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں باہم دگر کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ چیز قرآن مجید پر ایک بہت بڑے اعتراض کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس اعتراض کے ہوتے ہوئے قرآن کو ایک معجزہ ثابت کرنا تو الگ رہا ہم اس کے ایک منظم کتاب ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک بالکل مسلسل کلام ہے"۔

اس کے بعد سورہ کے مضمون پر اجمالاً گفتگو کر کے فرماتے ہیں :-

"ہر شخص جس میں انصاف ہو گا وہ دیکھ سکتا ہے کہ اگر آیت کی یہ تفسیر کی جائے جو ہم نے کی ہے تو یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک ایسے منظم کلام کی صورت میں ڈھل جاتی ہے جس میں ایک خاص موضوع پیش نظر رکھا گیا ہو اور یقیناً یہ تفسیر اس تفسیر سے کہیں بہتر ہو گی جو لوگ بیان کرتے ہیں"۔

اس کے بالمقابل ایک دوسری جماعت بھی ہے جس کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں کسی

قسم کا نظم نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ عزالدین بن عبدالسلام کہتے ہیں :-

"قرآن مجید بیس سال سے کچھ زیادہ کی طویل مدت میں، مختلف حالات کے لیے گوناں گوں احکام لے کر نازل ہوا۔ جس چیز کا نزول اس طرح ہوا ہو اس میں کسی قسم کا ربط و نظم نہیں ہو سکتا"۔

یہ علماء کے دو مختلف مذہب ہیں اور ان دونوں مذہبوں کے حامی و موید ہمارے ہاں موجود ہیں۔ میرے نزدیک پہلا مذہب صحیح ہے اور میں اسی کا پیرو ہوں۔

اس تفصیل سے میں دو باتیں واضح کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ نظم قرآن کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے بارہ میں علماء نے یک قلم سکوت اختیار کیا ہو بلکہ ایک گروہ نے اس کی طرف نہایت اہتمام کے ساتھ توجہ کی ہے۔ دوسری یہ کہ یہ ایک تنگ راہ ہے جس پر چلنے والے تھوڑے ہیں اور یہ ایک ایسا مدفون خزانہ ہے جس کا بہت قلیل حصہ اب تک دریافت ہو سکا ہے۔

مجھ پر نظم کا دروازہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے، سب سے پہلے سورہ بقرہ اور سورہ قصص میں کھولا۔ اور اس کی طرف میری رہنمائی باہر سے نہیں بلکہ خود قرآن کے اندر سے ہوئی۔ میں قرآن کی تلاوت کا ہمیشہ سے دلدادہ رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ میری سب سے زیادہ محبوب اور لذیذ کتاب یہی رہی ہے۔ میں سنا کرتا تھا کہ قرآن مجید چونکہ مختلف اوقات و حالات میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے، اس وجہ سے نظم کے اعتبار سے یہ سب سے زیادہ منتشر کتاب ہے۔ لیکن دو سورتوں میں مجھے نظم معلوم ہو گیا تو بقیہ سورتوں پر غور کرنے کی مجھے تحریک ہوئی۔ یہ اس زمانہ کا قصہ ہے جب میں ابتدائی زندگی کی تعلیمی مشغولیوں میں منہمک تھا اور اس طرح کے کسی کام کے لیے بہت کم وقت بچا سکتا تھا۔ اس طرح دس سال سے کچھ زیادہ کی مدت بیت گئی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق نے میری دست گیری فرمائی اور میں نے قرآن پر ایک طرف سے، اس نقطہ نظر سے غور کرنا شروع

کیا۔ سال بھر کی مدت میں اس کام کو میں نے تمام کیا۔ اس کے بعد یہ خیال ہوا کہ اپنے فکرو تدبر کا نتیجہ لوگوں کے سامنے پیش کر دوں۔ لیکن ایک عظیم ذمہ داری اور اس کے دور رس نتائج کے ہیبت ناک احساس نے مجھے ڈرا دیا۔ چنانچہ ایک طویل مدت تک میں قرآن مجید پر بار بار غور کرتا رہا اور اللہ تعالیٰ سے برابر دعا مانگتا رہا کہ وہ مجھے نفس کی شرارتوں اور جہل کی آفتوں سے محفوظ رکھے۔

نظم قرآن کو بطور دعویٰ پیش کرنے کے اسباب :

ہر چند کہ قرآن کے ایک منظم کلام ہونے کی حقیقت ایک عرصہ سے میرے سامنے بالکل واضح تھی لیکن میری دلی خواہش یہی رہی کہ میں اس کے اظہار کی مسئولیت اور اس کے خیر و شر کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو بچالے جاؤں۔ لیکن مندرجہ ذیل اسباب نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس ذمہ داری کے اٹھانے سے گریز نہ کروں۔

۱۔ امت میں تاویل قرآن کا اختلاف :

سب سے پہلی چیز جس نے مجھے اس ذمہ داری کے اٹھانے کے لیے مجبور کیا یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ تاویل کا بیشتر اختلاف نتیجہ ہے اس بات کا کہ لوگوں نے آیات کے اندر نظم کا لحاظ نہیں رکھا ہے۔ اگر نظم کلام ظاہر ہوتا اور سورہ کا مرکزی مضمون واضح طور پر سب کے سامنے ہوتا تو تاویل میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوتا، بلکہ سب ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے اور سب کے منہ سے ایک ہی صدا بلند ہوتی۔ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء (ابراہیم : ۲۴) (ایک بار آور درخت کی مانند جس کی جڑ زمین کے اندر دھنسی ہوئی ہو اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں) اور سارے مسلمان اللہ کی رسی کو متحد ہو کر تھام لیتے، جیسا کہ فرمایا ہے :

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا (اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور منتشر نہ ہو) لیکن جب صورت حالات اس کے بالکل برعکس ہو چکی ہے اور لوگوں نے

اس حبل اللہ المتین کو، جس کی تعریف یہ ہے کہ لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه (فصلت: ۴۲)(جس کے اندر باطل نہ اس کے آگے سے داخل ہوتا ہے نہ اس کے پیچھے سے) ٹکڑے ٹکڑے سمجھ رکھا ہے تو اس اختلاف سے نجات کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟ حالت یہ ہے کہ ہر فریق اپنے اپنے خیال کے مطابق قرآن کی تاویل کر رہا ہے اور کلام کو اس کی صحیح سمت سے ہٹا کر جس وادی میں چاہتا ہے اس کو گھسیٹے پھرتا ہے اور نظم کلام، جو صحیح سمت کو متعین کرنے والی واحد چیز ہے اور جس سے اہل بدعت و ضلالت اور اصحاب تحریف کی کجرویوں کی اصلاح ہو سکتی ہے، وہ بیچ سے بالکل غائب ہے۔

۲- قرآن مجید پر بے نظمی کا الزام:

دوسری چیز جو اس کے لیے محرک ہوئی وہ ملحدین کا اعتراض تھا۔ انہوں نے قرآن مجید پر بے نظمی کا الزام لگایا اور میں نے دیکھا کہ علمائے اسلام ان کے جواب میں بجائے اس کے کہ حق کا اظہار کرتے اور کتاب الٰہی سے اس الزام کو دفع کرتے، اسی قسم کی باتیں خود کرنے لگے جس قسم کی باتیں یہ ملحدین کہہ رہے تھے۔ ایسی حالت میں میرے لیے ممکن نہ رہا کہ میں حق کو سرنگوں اور باطل کو سربلند دیکھتا رہوں اور چپ چاپ بیٹھا رہوں بالخصوص جبکہ میں پورے یقین کے ساتھ محسوس کر رہا تھا کہ ملحدین کا اعتراض بالکل غلط ہے۔

۳- کلام کے مفہوم کے ایک حصہ سے محرومی کا خدشہ:

علاوہ ازیں یہ امر ہر شخص کو معلوم ہے کہ نظم کلام، کلام کا ایک جزو ہوا کرتا ہے۔ اگر اس کو چھوڑ دیجئے تو خود کلام کے مفہوم و معنی کا ایک حصہ غائب ہو جائے گا۔ ترکیب میں ایک زائد حقیقت ہوتی ہے جو ایک چیز کے متفرق اجزاء میں الگ الگ نہیں ہوا کرتی۔ انگور اور اس سے ترکیب پانے والی شراب ایک ہی چیز نہیں ہے۔ اس سبب سے اگر کوئی شخص فہم نظام سے محروم رہ جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خود کلام کی ایک بڑی حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئی اور عجب نہیں کہ وہ اہل کتاب کی اس صف سے جا ملے جس کا حال قرآن نے

یوں بیان کیا ہے کہ :-

فنسوا حظا مما ذکروا به فاغرینا بینهم العداوة والبغضاء الی یوم القیامة (المائدہ : ۱۴)

(پس انھوں نے ایک بڑا حصہ اس کتاب کا فراموش کر دیا جس کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی- نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور جھگڑے کی آگ بھڑکا دی)

مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ عداوت اور بغض، جس کی وبا آج مسلمانوں میں پھوٹ رہی ہے، اسی بات کا نتیجہ ہو کہ ہم نے نظم قرآن کو نظر انداز کر کے خود قرآن کے ایک حصہ کو نظر انداز کر دیا ہے- اگر ایسا ہے تو اس فتنہ کا دبنا مشکل ہے- اس کی وجہ، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، یہ ہے کہ جب کلام الٰہی کے معانی کے بارہ میں ہماری رائیں مختلف ہو جائیں گی تو لازماً ہماری خواہشیں اور ہمارے ارادے بھی مختلف ہو جائیں گے اور ہمارا حال وہی ہو جائے گا جو اہل کتاب کا ہوا- صرف یہ فرق ہو گا کہ ان کے لیے آخری بعثت اور آخری صحیفہ کے ذریعہ سے اصلاح حال کا موقع باقی تھا اور ہمارے لیے آخری چارہ کار صرف یہی قرآن ہے-(م : ۲۷-۳۰)

منکرین نظم کے اعتراضات کا جائزہ :

قرآن میں نظم کا انکار کرنے والے کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ ذیل کے دعووں میں سے کوئی ایک دعویٰ کرے- یا تو وہ یہ کہے گا کہ قرآن کی ہر سورت میں کچھ آیات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو نبی ﷺ کے بعد تیار کر لیا گیا- اس میں ترتیب کا کوئی لحاظ نہ تھا- آیات جس ترتیب سے لوگوں کے ہاتھوں میں آتی گئیں انھوں نے ان کو جوڑ دیا- یا وہ یہ کہے گا کہ سورہ کا نظم درہم برہم ہو چکا ہے- پہلے یہ ایک مربوط کلام تھا لیکن بعد میں اس کے اندر توضیح کے لیے کچھ آیات داخل کر دی گئیں جنھوں نے نظم کو ختم کر دیا- یہ دونوں دعوے

قرآن کے جمع و ترتیب اور نزول اول کے بعد توضیح مزید کرنے والی آیات کے مواقع کے بارے میں صریح بے خبری پر مبنی ہیں اور ان کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہے۔

جہاں تک پہلے دعویٰ کا تعلق ہے وہ اس لیے باطل ہے کہ تمام سورتیں نبی ﷺ کے عہد میں پڑھی جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نبی ﷺ کو حکم دیا تھا کہ وہ ان کی تلاوت حضرت جبریلؑ کی تلاوت کے مطابق کیا کریں۔ چنانچہ حضور لوگوں کو مکمل سورہ سکھاتے اور ان سے سنا کرتے تھے۔ مصاحف میں جو قرآن جمع کیا گیا وہ جبریل علیہ السلام کی لائی ہوئی اسی ترتیب کے مطابق جمع ہوا جس کی قرأت نبی ﷺ نے ان کے سامنے کی تھی۔ اگر مذکورہ دعویٰ صحیح ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو جبریل کی قرأت کی اتباع کا حکم کیوں دیتا[۳]۔ اور نبی ﷺ کتابت کے بعد آیات کو ان کے مخصوص مقامات پر ہی رکھنے کا حکم کیوں دیتے؟

جہاں تک دوسرے دعویٰ کا تعلق ہے وہ اس لیے باطل ہے کہ اگر ایک منظم کلام کے اندر کوئی ایسی آیت داخل کی جائے جو وہاں داخل کیے جانے کے لائق ہو تو اس سے نظم کو نقصان نہیں پہنچتا۔ لہذا جو آیات اصل مضمون کی وضاحت کے لیے بعد میں لائی گئیں ان کا ماسبق و مابعد جملوں کے ساتھ ربط معلوم تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان آچکا تھا کہ کتاب احکمت آیته ثم فصلت من لدن حکیم علیم۔ (ھود: ۱)

(یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں، پھر خدائے حکیم و علیم کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی)

ایک تیسرا دعویٰ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں چاہا کہ قرآن کو وہ شعر یا سجع یا کسی ایسی صورت میں نازل فرمائے جس میں لوگوں کے لیے کوئی اعجوبہ یا تکلیف ہو اسی طرح اس نے ایک منظم کلام اتارنا بھی پسند نہیں کیا۔ قرآن کی حیثیت ایک ایسے کلام کی تھی جس سے ہدایت اور حکمت کی تعلیم مقصود تھی۔ لہذا دلائل اور احکام کے نزول کا تقاضا جیسے جیسے سامنے آتا رہا وہ نازل کیے جاتے رہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ مختلف اسباب کے الگ

الگ تقاضے سامنے آگئے تو کلام بھی انہی کی رعایت سے نازل ہوا- لہذا کوئی سورہ ایسے متفرق مطالب کی جامع نازل ہو گئی جن کی ضرورت زمانہ نزول میں محسوس ہوئی- ایک ہی زمانہ میں احوال و حوادث اور ان کے تقاضے ایسے بھی جمع ہو جایا کرتے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں- لہذا ایک سورہ میں علیحدہ علیحدہ نہایت عمدہ اور منظم آیات جمع ہوتی ہیں لیکن ان کے مجموعے کا کوئی ایسا مفہوم نہیں ہوتا جس کی خاطر اس کے نظم کی تلاش کی جائے-

یہ دعویٰ اس لیے درست نہیں کہ اگر قرآن میں نظم کی رعایت ملحوظ نہ ہوتی تو ہمارے مشاہدہ میں یہ بات نہ آتی کہ سورتوں کے بڑے طویل حصے ہیں جو ایک ہی جامع اسلوب پر مبنی ہو کر آئے ہیں- نیز سورتوں میں طویل فاصلوں پر ایسے کلمات آتے ہیں جو پیچھے گزرے ہوئے کلمات کی طرف دوبارہ توجہ دلاتے ہیں- مثال کے طور پر سورہ بقرہ کے آغاز میں فرمایا- هدى للمتقين (یہ ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے) پھر کلام کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ اہل تقویٰ کا ذکر دوبارہ کیا اور فرمایا:

اولئک الذین صدقوا و اولئک هم المتقون (بقرہ: ۱۷۷)
(یہی لوگ ہیں جنھوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں)

جب اس موقع سے قبل اور بعد کی آیات پر ہم غور کرتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ متقین کا ذکر یہاں محض اتفاق سے نہیں آیا- اس طرح کی مزید واضح تر مثالیں بکثرت دی جا سکتی ہیں- (ر: ۵۲)

کیا عرب مربوط کلام کو پسند نہیں کرتے تھے؟

بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ ایک منظم کلام کہنا جو کسی خاص موضوع تک رہنمائی کرتا ہو، عربوں کی عادت نہیں ہے- ان کے اشعار میں واضح بے ربطی موجود ہوتی ہے- لہذا اگر قرآن ان کے اس معروف اسلوب سے ہٹ کر کسی دوسرے اسلوب پر نازل ہوتا تو ان پر

گراں گزرتا۔ علماء کا یہ خیال باطل ہے کیونکہ اہل عرب شاعری کو غیر سنجیدگی سے لیتے اور اس کو اعلیٰ درجہ کی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس وہ حکماء کی تعلیم کرتے اور پر حکمت خطبوں کو پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اشراف شعر کہنے اور شاعر کے طور پر معروف ہونے کو عار سمجھتے۔ ان کے ہاں شعر کا استعمال کہیں کہیں کسی حکیمانہ بات کا حوالہ دینے یا ضرب المثل کے طور پر پیش کرنے کے لیے تھا۔ محض منظوم کلام یا اس میں وزن کا پایا جانا شعر شمار نہیں ہوتا تھا۔ شعر میں ایسے موضوعات لے لیے جاتے جو لوگوں کے لیے مزاح کا باعث ہوں اور ان کو خوش کر دیں۔ بہر طور شاعری ایک غیر سنجیدہ چیز تھی۔ جو شخص شاعری کے موضوعات سے ہٹ کر کچھ کلام موزوں کر لیتا وہ شاعر شمار نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ محض ایک نظم کہنے والا ہوتا تھا۔

شاعری کے اسی معروف پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان من الشعر حکمۃ[5] (کسی کسی شعر میں کوئی دانائی کی بات ہوتی ہے)

نیز فرمایا: ان من البیان لسحرا[6] (کسی بیان میں جادو کی تاثیر ہوتی ہے)

آپ کا مطلب یہ تھا کہ شاعری میں کہیں نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں دانائی کی بات کہی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو شاعری کی لت سے منزہ فرمایا۔ ارشاد ہوا:

> وما علمناہ الشعر و ما ینبغی لہ ان ھو الا ذکر و قرآن مبین لینذر من کان حیا و یحق القول علی الکافرین۔(یٰس: ۶۹-۷۰)
>
> (اور ہم نے اس کو شعر کی تعلیم نہیں دی ہے اور یہ اس کے شایان شان بھی نہیں۔ یہ تو بس یاد دہانی اور نہایت واضح قرآن ہے تاکہ وہ ان لوگوں کو آگاہ کر دے جن کے اندر زندگی ہے اور کافروں پر حجت تمام ہو جائے)

اگر شعر اور بیان کا فرق واضح ہو چکا ہے اور یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہے کہ اہل عرب کا بیشتر سنجیدہ کلام شاعری نہیں تھا تو کیا یہ دعویٰ کرنا صحیح ہو گا کہ قرآن مجید کو شاعری پر محمول کیا جائے اور اس کو بے ربط سمجھا جائے- غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے بے مقصد اور بے ربط کلام کو شاعروں کا عیب کیوں بتایا ہے اور اس کو جھوٹ پر کیوں محمول کیا ہے جبکہ جھوٹ کی برائی ظاہر ہے- اس نے متنبہ کیا ہے کہ ایک متعین موضوع اور مربوط نظام کے بغیر بے مقصد کلام کہنے والے کی کم عقلی کی دلیل ہوتا ہے- لہذا ایسے شاعروں کی مذمت میں فرمایا:

الم تر انہم فی کل واد یہیمون و انہم یقولون مالا یفعلون (شعرا : ۲۲۵-۲۲۶)

(کیا نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور وہ کہتے ہیں جو وہ کرتے نہیں؟)

ہر وادی میں بھٹکتے پھرنے کا مطلب بے مقصد اور بے ربط باتیں کرنا ہے- ایسے کلام میں عقل کے لیے کوئی رغبت نہیں ہوتی- البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ نفس کو کبھی کبھی سوچ سے خالی دلچسپیوں کی طرف رغبت ہو جاتی ہے تو وہ شاعری کی طرف مائل ہو جاتا ہے- اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ نفس کبھی شراب، موسیقی اور ایسے مشغلوں کی طرف بھی مائل ہوتا ہے جو اس کو تفکرات سے وقتی طور پر غافل کر دیں- حقیقت میں یہ تو خود ایک بیماری ہے، یہ بیماری کا علاج نہیں ہے-(ر: ۳۲-۳۳)

کیا نظم قرآن کا علم مہمات دین میں سے نہیں ہے؟

جو لوگ قرآن میں نظم کے قائل نہیں ان کا ایک خطرناک گمان یہ ہے کہ یہ علم اپنی مشکلات اور غلطی کے امکانات کی وجہ سے مہمات دین میں سے نہیں ہے- اس لیے ہمیں زیادہ اہم اور زیادہ نافع چیزوں ہی کی طرف توجہ کرنی چاہیے کیونکہ حدیث میں بھی آتا ہے کہ

من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ

(آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز کو چھوڑ دے جو اس سے متعلق نہیں)
ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ نظم کلام کے لطیف نکات تلاش کرنا اور اس کے اندر بلاغت کے پہلوؤں کا استنباط کرنا فرصت کا کام ہے- جو شخص اس علم کو مہمات علوم میں شمار کرے اور طلبہ کو اس پر آمادہ کرے، وہ انھیں ایک واجب سے ہٹا کر ایک غیر واجب پر لگاتا اور اس طرح نظام تعلیم میں دخل اندازی کرتا ہے- یہ شبہ ہم نے بعض ایسے لوگوں سے بھی سنا ہے جو نظم قرآن کے وجود کا اعتراف کرتے ہیں- وہ کہتے ہیں کہ قرآن اس لیے نازل ہوا کہ ہم اس پر عمل کریں اور اس کے نور سے ہدایت حاصل کریں- یہ اس لیے نہیں آیا کہ ہم اس کے لطائف اور اس کی بلاغت کے نکات تلاش کرنے کے درپے ہوں- تم نے دیکھا کہ باطل اپنا کام کرنے سے غافل نہیں ہوتا اور لوگوں تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرنا اس کے لیے کچھ دشوار نہیں- اس کا اگر ایک راستہ بند کرو گے تو دوسری جانب سے آدھمکے گا- اللہ کی توفیق سے میں اس شبہ کا جواب دیتا ہوں-

اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراض کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے پیش نظر ہے کیا؟ بلاغت کے نکات اور اعجاز کے پہلو تلاش کرنا ہمارے نزدیک نہ مقصود بالذات ہے اور نہ ہی اصل غایت- بلکہ نظام کلام کا جاننا اور آیات کے مفہوم کے ربط کا تلاش کرنا بھی ہمارا مطلوب نہیں- یہ تمام چیزیں اسباب ہیں، مقصود قرآن کے بیان کا مفہوم سمجھنا ہے- علم نظم اسی تدبر کا ایک وسیلہ ہے- کیا اب بھی تم یہی گمان رکھو گے کہ تم اس سے مستغنی ہو اور تمھیں اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکمت، نور اور شفا کے سرچشموں کے جاننے کی کوئی ضرورت نہیں؟ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ اپنے آپ کو ان لوگوں میں شمار کرو، جن کا قول یہ ہے کہ خدا کے اوامر و نواہی جاننے کے لیے ہمارے لیے فقہ کی کتابیں کافی ہیں اور قرآن کی کوئی حاجت باقی نہیں رہی؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ظاہری احکام عقائد اور نیتوں سے وابستہ ہوتے ہیں اور عقائد اور نیتیں باطن اخلاق سے وابستہ ہیں- اسی طرح افراد کی درستی کا دار و مدار

جماعت کی درستی پر ہے اور جماعت کی درستی کے لیے حکمت و تدبیر کے بعض مخفی اصول درکار ہوتے ہیں- جب تک تمام کام ٹھیک ہوتے رہیں جیسے کہ صحت کی حالت میں طبیعت رواں ہوتی ہے تو اس وقت تک اخلاق کی تربیت، نیتوں کی درستی اور اصلاح کے اصولوں کی حاجت ہمیں کم ہوتی ہے لیکن جب فساد غالب آجائے، عقائد خراب ہو جائیں، دل بگڑ جائیں، ملت کا نظام منتشر ہو جائے، شریعت کا نظام پارہ پارہ ہو جائے اور بدعت و ہوائے نفس کی حجت غالب آنے لگے، اس وقت ہمیں اس بات کی شدید حاجت ہوتی ہے کہ خدائی حکمت معلوم کریں، شفا کا راستہ جانیں اور دینی اختلافات کے فتنوں سے بچنے کی راہ تلاش کریں- یہ حکمت اور ہدایت قرآن حکیم سے حاصل ہو سکتی ہے جسے خدا نے خود نور اور شفا کا نام دیا ہے- لیکن جہالت عام ہے، ہر شخص اپنی رائے ہی پر نازاں ہے- اس صورت حال میں سوال یہ ہے کہ قرآن کی حکمت سے کیا ایک ایسا آدمی واقف ہو سکتا ہے جو ہوا کے ایک تیز جھونکے یا ایک سوار کی سرعت کے ساتھ قرآن کے پاس سے نکل جائے؟ اگر ایسا ممکن تھا تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں آیات میں تفکر و تدبر کا حکم کیوں دیا؟ اگر آیات میں معارف کے خزائن پوشیدہ نہ تھے تو تفکر و تدبر کا فائدہ کیا تھا؟ اگر تمہارا گمان یہ ہو کہ قرآن مجید کے معارف مکمل طور پر اس کی آیات میں بیان ہو گئے ہیں، چاہے کوئی نظم کو سمجھے یا نہ سمجھے جملوں کی تضمنات سے واقف ہو سکتا ہے، جس طرح اصل قیمت جواہر کی ہوتی ہے، انہیں ایک لڑی میں پرونا ضروری نہیں، تو ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ گمان اس لیے پیدا ہوا کہ تم یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ہر مرکب میں ترکیب اور نظم کی اہمیت ہوتی کیا ہے، کسی کلام میں اور خصوصاً قرآن میں یہ چیز کتنی ضروری ہے-

نظم قرآن کا علم کیوں ضروری ہے؟

۱- کلام کا نظم جانے بغیر اس کو سمجھنا محال ہے:

اوپر کے مباحث میں دین کے نظام میں اور انسان کی صلاح و فلاح میں قرآن کی تعلیم و تعلم

کا مقام واضح ہو چکا ہے۔ اب اس بات پر غور کرو کہ سمجھے بغیر قرآن کا علم کیا ممکن ہے؟ کیا تم یہ تصور کر سکتے ہو کہ متکلم نے جس مقصد کے لیے اپنے کلام اور اسلوب بیان کو ذریعہ بنایا ہے تم اس مقصد سے واقف ہو سکو گے جب تک تمہیں کلام کے مختلف حصوں کا اجمالی طور پر تعلق معلوم نہ ہو، پھر اس کے موقع و محل کا اندازہ تمہیں نہ ہو اور انکی مدد سے ربط کلام کے صحیح پہلوؤں کو تم الگ الگ نہ کر سکو؟ ایک جملہ دوسرے متصل جملہ سے کئی اعتبارات سے مربوط سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسے موقعوں پر جو شخص جملوں کا صحیح ربط نہیں سمجھ پاتا یا اس کو معین کرنے میں غلطی کر دیتا ہے تو وہ اصل مفہوم کو کھو دیتا ہے اور کلام میں جو علم و حکمت پائی جاتی ہے اس پر وہ مطلع نہیں ہو سکتا۔ یہ بات محال ہے کہ تم کلام کے مختلف حصوں کا تعلق جانے بغیر کلام کو سمجھ لو گے کیونکہ جب تم اس کے ایک طویل حصہ پر غور کرو گے تو اس کا کچھ مفہوم ذہن سے اتر جائے گا۔ پھر جب ایک حصہ کے اجزا کا تعلق سمجھنا چاہو گے تو دوسری طرف کے کئی پہلو نظر انداز ہو جائیں گے۔ اس طرح اجزائے کلام کی جتنی نسبتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی اس کے بقدر تم کلام کو نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن اگر یہ نسبتیں تم سمجھ جاؤ اور دیکھ لو کہ وہ عبارت بالکل مربوط کلام ہے جو ایک ہی مضمون کی حامل ہے تو اس کا حسن بیان تم پر ظاہر ہو جائے گا۔ (ر: ۲۸)

۲۔ کلام ترکیب سے ذو معنی بنتا ہے:

اپنے ارد گرد اور اوپر نیچے کی موجودات پر نگاہ ڈالو۔ تم دیکھو گے کہ یہ نفع بخش اور تمتع کے لیے ترکیب دی گئی ہیں۔ ان کے منافع و محاسن کا بڑا حصہ ترکیب ہی میں پوشیدہ ہے۔ اگر چاہو تو یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ ہر شے کی اصل ماہیت اور اس کے وجود کی حقیقت ترکیب ہی ہے۔ اس کی ترکیب ختم کر دو تو کچھ باقی نہ رہے گا۔ اسی لیے صنعت و کمال کا راز بھی درست ترکیب ہی میں پنہاں ہے اور ترکیب کی مضبوطی یا کمزوری ہی کی بنا پر بنانے والے کی مدح یا ذم کی جاتی ہے۔ اسی طرح ہر عمل اور ہر تدبیر کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس کی ترکیب پر ہوتا

ہے- گویا ترکیب ہی ہر چیز کی بنیاد ہے اور یہ حقیقت اہل عقل سے پوشیدہ نہیں-اس وضاحت کے بعد اب کلام میں ترکیب کی اہمیت پر غور کرو- کلام کے تمام حصے آپس میں متعلق ہوتے ہیں اور ترکیب ہی کے بعد ذو معنی بنتے ہیں- ان کی صورت ترکیبی ہی کلام کے معنی متعین کرتی ہے- کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ ایک لفظ میں بھی جب حروف ایک خاص ترتیب سے آتے ہیں تو اس میں معنی پیدا ہو جاتے ہیں- ایک جملہ میں کلمات کی ترتیب کا بھی یہی حال ہے- وہاں بھی جملہ کے معانی کلمات کی ترتیب سے متعین ہوتے ہیں- پھر مختلف جملوں کی ترکیب ہی کے نتیجہ میں ایک عمدہ کلام، ایک دلکش گفتگو، ایک گہری حجت اور دل نشین حکمت پیدا ہوتی ہے، جو علم و فضل اور فصاحت و بلاغت پر مشتمل ہوتی ہے- پس اس میں کوئی شک نہیں کہ کلام میں خوبی اس کے نظام ہی سے پیدا ہوتی ہے اور بلاغت کے لحاظ سے وہ اگر اونچا ہوتا ہے تو محض اپنے اجزاء کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے نظم و ترتیب کی بنا پر اونچا ہوتا ہے - لہذا کوئی شخص اگر کلام کے حسن بیان، قوت استدلال، دلوں میں اس کی تاثیر اور اس کی پوشیدہ حکمت سے واقف ہونا چاہے تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ اس کے جملوں کی ترکیب کو سمجھے-

اگر تمہیں ہمارے اس بیان پر اب بھی شک ہو یا تم مزید اطمینان یا وضاحت چاہو تو ایک فصیح و بلیغ خطبہ لو جس میں ترغیب و ترہیب کے مضامین ہوں، حکمت ہو، امثال ہوں، حجت و استدلال ہو- اب اس خطبہ کا نظام درہم برہم کر دو اور جملوں کو مطالب کی رعایت کیے بغیر آگے پیچھے کر دو- اب دیکھو گے تو معلوم ہو گا کہ اس کے دعوی و دلیل کا تعلق، اس کے مقدمات سے مقاصد تک تدریج، ضروری مقامات پر وضاحت، اس کا حسن بیان، کمال بلاغت، اس کے مطالب، فوائد، حل شبہات اور تاریخی، اخلاقی اور حکیمانہ معارف کا بیان کس طرح ناپید ہو جاتا ہے- نظام ختم ہونے پر اس حکیمانہ خطبہ کی حیثیت ہذیان کی سی ہو جاتی ہے-(ر: ۲۹-۳۲)

۳- قرآن کا اعجاز حسن ترتیب کے بغیر بے معنی ہے :

حضرت خاتم النبیین ﷺ کی نبوت کی سب سے افضل اور پائندہ تر، مضبوط ترین اور واضح ترین دلیل قرآن مجید ہے- ہم یہ بات بالبداہت جانتے ہیں کہ حسن ترتیب ایک بلیغ کلام کی سب سے بڑی خوبی ہے- ہم قرآن کے معجزہ ہونے پر بھی یقین رکھتے ہیں- پس کیا ہم یہ پسند کریں گے کہ قرآن کو حسن و ترتیب سے عاری قرار دیں؟ ہم اس کے معانی کے ربط اور اس کے لوازم اور اس کی ترتیب کی پختگی میں غور و فکر کرنے کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟ کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ ہم کسی بھی عقل مند و پختہ کار آدمی کے کلام کو ترتیب سے عاری کر کے خوش نہیں ہو سکتے؟ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک قادر الکلام خطیب جو فن بلاغت کو استعمال میں لاتا اور حسن بیان سے لوگوں کو فریفتہ کر لیتا ہے، کی قدر تمہارے دل سے اس لیے اٹھ جاتی ہے کہ اس نے ربط کلام سے غفلت برتی اور ایک وادی سے دوسری وادی میں بھٹکنے لگ گیا- وہ چاہے اپنے خطاب کو اس طرح ڈھیلا چھوڑ دینے کے لیے معذور ہو کہ وہ خطاب پر مکمل غور و فکر نہ کر سکا ہو مگر یہ رد عمل اس لیے ہوتا ہے کہ ایک بلیغ کلام سوء ترتیب کو ہرگز برداشت نہیں کرتا- اگر امر واقعہ یہی ہے تو اعجاز قرآن پر یقین رکھنے والے آدمی کی کیا یہ ذمہ داری نہیں کہ وہ قرآن کے نظام کے حسن اور اس کی ترتیب کی پختگی کو ثابت کرے-(ر :۵۱)

۴- اعلیٰ حقیقتوں تک رسائی نظم کلام سے ممکن ہوتی ہے :

عام باتیں جب کسی برتر عمومی حوالے سے دیکھی جائیں تو وہ مربوط ہو کر اعلیٰ حقیقتوں تک پہنچاتی ہیں- یہ نظم کلام ہی ہوتا ہے جو ان اعلیٰ حقیقتوں اور حکمتوں تک رہنمائی کرتا ہے- یہی اعلیٰ حقیقتیں اصل غایت ہوتی ہیں- جو شخص نظم کو نہیں سمجھتا وہ ان حقائق، حکمتوں اور غایتوں سے بے خبر رہتا ہے- چنانچہ ایسے شخص کا حصہ اعتقاد و عمل میں کم رہ جاتا ہے- صحیح عقائد کی آدمی کو خبر نہ ہو تو عین ممکن ہے کہ وہ پروردگار کے بارے میں سوء ظن میں مبتلا ہو

جائے اور اس کے ساتھ اس کی صحیح نسبت قائم نہ رہے۔ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور یہ عقائد ہی سے پھوٹتے ہیں۔ اس لیے ان کی حکمتوں اور غایتوں سے کم علمی آدمی کے لیے ان کی قرار واقعی بجا آوری کا دروازہ بند کر دے سکتی ہے۔ مثلاً نماز میں ذکر کا فقدان یا زکوۃ میں تقویٰ کا فقدان ہو جائے۔ بعض اوقات یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ آدمی بالکلیہ ہی بعض اعمال کو ترک کر دے جیسے بہت سے لوگوں سے اعمال حج کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس طرح قدردان اور علیم ہے اسی طرح بخشنے والا اور حلم والا بھی ہے۔ مگر جاننے والے اور نہ جاننے والے کیا برابر ہو سکتے ہیں؟

اکثر حکمتیں اور برتر حقائق نظم کی دلالت کی روشنی میں سمجھ میں آتے ہیں۔ لہذا جو شخص نظم میں غور و فکر چھوڑتا ہے وہ قرآن کے مفہوم کے اس برتر حصے کو چھوڑتا ہے۔ قرآن حکمت اور نور ہے۔ نبی ﷺ کے ارشاد "الا انی اوتیت القرآن و مثله معه بل اکثر" (آگاہ رہو کہ مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اسی کی مانند بلکہ اس سے زیادہ بھی) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ زائد چیز قرآن کا فہم ہے۔ یہ ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔ نظم کا فہم بھی اسی سے متعلق ہے کیونکہ یہ مفہوم میں بڑا اضافہ کر دیتا ہے۔ (ر: ۵۰)

حضرت ابو بکرؓ نے زکوۃ روک لینے والوں سے جو جہاد کیا اس کی دلیل ان کو نظم قرآن ہی کے اندر سے ملی۔ ان کے استدلال کی ترتیب گویا یوں تھی کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے وہ از روئے شریعت ہم سے الگ ہیں اور ہم کو ان سے قتال کا حکم ہے۔ تو جو لوگ زکوۃ نہیں دیتے ان کے لیے بھی یہی حکم ہونا چاہیے۔ کیونکہ زکوۃ کا ذکر ہمیشہ نماز کے ساتھ ہوا ہے۔ جب کتاب اللہ میں اس کی جگہ نماز کے بعد ہے تو لازماً یہی جگہ اس کی دین کے اندر بھی ہونی چاہیے۔

اسی ذیل میں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ربا کی حقیقت قرآن میں زکوۃ کی حقیقت کے خلاف قرار دی گئی ہے اور سود خوروں سے جنگ کی اجازت دی گئی ہے تو لازماً یہی حکم

مانعین زکوٰۃ کا بھی ہونا چاہیے۔(م: ۵۸)

۵۔ حکمت قرآن نظم قرآن کے وسیلہ سے حاصل ہوتی ہے:

نبی ﷺ کو خدا نے جس طرح احکام کی تعلیم کے لیے بھیجا اسی طرح حکمت کی تعلیم کے لیے بھی مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے تزکیہ کو حکمت کے ساتھ مربوط فرمایا اور اسے "خیر کثیر" کا نام دیا ہے۔ جو شخص اس حکمت سے غافل ہو جائے وہ نبی ﷺ کی بعثت کے مقصد، اپنے دین کی تکمیل اور اپنے نبی کی تعلیم کو نظر انداز کرتا ہے اور حضور کا قرار واقعی اتباع نہیں کرتا۔ اگرچہ ضروری نہیں کہ انسان غایت مطلوب کو پہنچ جائے مگر ہماری طرف سے اس کی کوشش لازم ہے۔ انسان کی کوشش کے مطابق ہی اللہ تعالیٰ اپنا فضل اسے عطا کرتا ہے۔

کلام کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے مختلف حصے اس وقت تک مربوط نہیں ہوتے جب تک مختلف مطالب پر مشتمل کوئی جامع حقیقت ان میں جاری و ساری نہ ہو۔ اب جو شخص نظم کا طالب ہوتا ہے اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ سامنے جو کچھ دیکھ رہا ہے اپنی نظر اس سے بلند تر کرے اور جامع اور عام حقیقت کو تلاش کرے۔ یہی جستجو حکمت کا زینہ ہے اور یہ صاحب بصیرت اور ذہین آدمی کو عطا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام ایسا بنایا ہے کہ اس کے فہم کے لیے تفکر و تدبر ضروری ہے۔ اس سے مقصود حکمت کی تعلیم تھی۔ آیت وَ اِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ۔(زخرف: ۴) میں قرآن کو جو علی کہا ہے تو حکمت پر مشتمل ہونے کی بنا پر کہا ہے۔(ر: ۴۵)

۶۔ نظم کی تربیت امت کو وحدت کی طرف پھیرتی ہے:

تاویل قرآن میں ہمارے ہاں بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہمارے عقائد مختلف ہوئے اور ہمارے دلوں کی الفت ختم ہوئی۔ یہ نظم کی خاصیت ہے کہ وہ تمام امور کو ایک وحدت کی طرف پھیرتا ہے اور مفہوم کے اختلاف کو ختم کرتا ہے۔ انسانیت کے اعلیٰ درجات تک رسائی کے لیے اتفاق و اتحاد سب سے بڑا مطلوب ہے۔(ر: ۵۱)

نظم کے پوشیدہ رہنے کے اسباب

علم نظام کے جاننے والے اگرچہ پہلے بھی رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔اب ہم وہ اسباب بتاتے ہیں جن کی بنا پر یہ علم پوشیدہ رہا ہے۔

قرآن مجید میں نظم کے وجود کا انکار جن لوگوں نے کیا ہے انہوں نے اپنی خوشی سے ایسا نہیں کیا، اگر وہ اس انکار پر مجبور نہ ہو گئے ہوتے تو اس سے یقیناً باز رہتے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی عقلمند آدمی لوگوں کے درمیان اپنا کلام پراگندہ حالت میں چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔اگر کلام کی پراگندگی ایک مدت کے بعد بھی مصنف پر ظاہر ہو جائے تو وہ اس پر نظر ثانی کر کے اسے ممکن حد تک دور کر دیتا ہے۔اسی طرح آدمی جس شخص سے حسن ظن رکھتا ہو، اسے پراگندہ کلامی سے متہم نہیں کرتا۔اگر کرتا ہے تو اس وقت جب وہ اس کا کلام سمجھنے سے عاجز آجاتا ہے۔اس صورت میں وہ اپنی ذات کے قصور کو تسلیم کرنے کی بجائے اسے کہنے والے کی خامی پر محمول کرتا ہے۔یہ معاملہ تو اس وقت پیش آتا ہے جب کلام مخلوق کا ہوتا ہے۔لیکن اگر کلام پاک بلند مرتبہ خالق کا ہو، وہ محفوظ ہو اور ترتیب نزول پر مرتب بھی نہ ہوا ہو، اس کا القا ایک امانت دار فرشتے نے ایک ایسے فصیح اللسان نبی پر کیا ہو جو فصاحت اور بیان میں شہرت رکھنے والی قوم میں سے ہو، اس فرشتے نے یہ کلام نبی کو کئی مرتبہ پڑھ کر سنایا ہو اور پھر اس بات میں بھی شک کرنے کی گنجائش نہ ہو کہ ہر چیز کا حسن اور اس کی نفع بخشی اس کے تناسب اجزا ہی میں مضمر ہوتی ہے، بالخصوص جب اس کا تعلق بلیغ کلام سے ہو اور کلام بھی وہ جس نے بلیغ قوم کو یہ چیلنج دے رکھا ہو کہ وہ اس کی مانند زیادہ نہیں تو ایک ہی سورہ پیش کریں پھر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اللہ اور اس کی کتاب پر ایمان لانے والا ایک مسلمان کس طرح گمان کر سکتا ہے کہ یہ کتاب عمدہ نظم سے عاری ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے قرآن میں نظم کا انکار کیا ہے، انہوں نے بعض ایسے اسباب کی بنا پر ایسا کیا جن کے

آگے وہ بالکل مجبور ہو گئے تھے- اب ہم ان میں سے چند اہم اسباب کا ذکر کریں گے تاکہ تم ان کا عذر جان سکو اور ان کے ساتھ تمہارا حسن ظن باقی رہے اور تاکہ تم تقلید محض سے نکل کر حق کی طرف آسکو-

پہلا اور سب سے قوی سبب کلام اللہ کو ہر عیب اور نقص کے الزام سے بری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے- اس میں شک نہیں کہ بیشتر مقامات پر قرآن کا نظم بالکل ظاہر ہے لیکن اگر ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہوتا کہ پورا قرآن منظم ہے اور اس کے نظم کی رعایت لازمی ہے تو انہیں ایسے مقامات میں انکار نظم پر مجبور ہونا پڑتا جہاں نظم کی تلاش اس کے دقیق ہونے کی وجہ سے مشکل ہے- لہذا انہوں نے اثبات نظم کے مسلک ہی کو اختیار نہ کیا- نظم سے لا علمی کو انہوں نے اپنے فہم کے قصور پر محمول اس لیے نہ کیا کہ بظاہر بعض چیزیں اصول نظم کے خلاف انہیں نظر آئیں اور انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ ان مواقع پر کسی نظم کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں- اس طرح کا ایک موقع آیت "حافظوا على الصلوت والصلوة الوسطى "(البقرہ: ۲۳۸)(تمام نمازوں کی حفاظت کرو اور خصوصا درمیانی نماز کی) پیش کرتی ہے- یہ آیت جس موقع پر آئی ہے اس سے پہلے عورتوں کے معاملات کا ذکر ہے- اس آیت کے بعد دوبارہ کلام اسی پہلے ذکر کی طرف لوٹ جاتا ہے- اگر درمیان میں یہ آیت نہ ہوتی تو پورا بیان متصل ہوتا- جن لوگوں نے اس آیت کی مناسبت واضح کی ہے انہوں نے کوئی ایسی چیز نہیں پیش کی جسے ایک انصاف پسند آدمی قبول کر سکے، جو بات کو سنے اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرے- جو لوگ وجود نظم پر یقین رکھتے ہیں، ان میں سے بعض نے اس آیت کے نظم کے متعلق اپنے فہم کی درماندگی کا اعتراف کر لیا اور یہی محفوظ طریقہ بھی تھا- اللہ تعالیٰ نے ہمارے برسوں کے فکر و تدبر کے بعد اس مشکل سے ہمارے لیے پردہ اٹھا دیا- اس پر اللہ رب العالمین کا شکر ہے- اگر وہ ہدایت نہ دیتا تو ہم کبھی رستہ نہ پا سکتے-

دوسرا سبب (جو کو پہلے کی نسبت کم اہم نہیں ہے، لیکن اس کا تعلق مصنفین کے بجائے ان مصنفین کے عام قارئین سے ہے) یہ ہے کہ جن لوگوں نے نظم کی طرف توجہ کی (مثلاً امام رازیؒ) انہوں نے اس مشکل کام میں ایسی چیزوں پر قناعت کرلی جو تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور تھیں۔ اگرچہ امام رازیؒ نظری علوم اور فہم وذکاوت میں بہت آگے ہیں، لیکن ان کے کلام پر غور کرنے والے ہر شخص کو یقین ہو جاتا ہے کہ جس نظم کا یہ تبحر امام اور ان جیسے دوسرے لوگ دعویٰ کرتے ہیں، اگر اس کا کوئی وجود ہوتا تو ان جیسے غور و فکر کرنے والے لوگوں سے مخفی نہ رہا ہوتا۔ جب وہ نظم کی نہایت کمزور توجیہات کر دیتے ہیں تو پڑھنے والے کے اندر اس علم کا شوق ہی باقی نہیں رہتا۔ جس شخص پر یہ اثر پڑتا ہے، وہ نظم کا اقرار کرنے کے موقف پر قائم نہیں رہتا بلکہ وہ اس علم ہی سے مایوس ہو کر اپنے اوپر اس کا دروازہ بند کرلیتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اس کو نظم کی طرف متوجہ بھی کرے تو یہ اس کی بات پر کان نہیں دھرتا۔ بصورت دیگر وہ ایک ایسی رائے اختیار کرلیتا ہے جس کے متعلق اس کا گمان ہوتا ہے کہ یہ نہایت محفوظ ہے۔ وہ یہ کہ قرآن چونکہ الگ الگ وقتوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نازل ہوا ہے اس لیے اس میں نظم کی تلاش فضول ہے۔

تیسرا سبب جو نظم قرآن کے اخفاء کا باعث ہوا ہے، تاویل کے متعدد پہلوؤں، بکثرت مختلف معنوں اور روایتوں کا موجود ہونا ہے۔ نظم، کلام کو ایک وحدت کی طرف لے جانے والی چیز ہے۔ تاویلیں جتنی مختلف ہوں گی نظم کی تلاش اسی قدر مشکل ہو گی۔ جو شخص ان مختلف اقوال وروایات اور تاویل کے ایک دوسرے سے متضاد پہلوؤں کو دیکھتا ہے وہ اس شش وپنج میں پڑ جاتا ہے کہ ان میں سے کون سی رائے کو اختیار کرے۔ اس کی حالت اس شخص کی ہوتی ہے جو ایک چوراہے پر کھڑا ہو اور اسے یہ نہ معلوم ہو کہ اسے کس رستہ پر جانا ہے۔

اس صورت حال اور بعض دوسرے اسباب کی بناء پر ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ صرف اسی تاویل پر قناعت کی جائے جس سے کلام منظم ہو جائے۔ اس طریقہ کو ہم نے

تاویل کے اعتبار سے زیادہ اچھا اور اصول بلاغت کے مطابق پایا ہے- تاویل کی بکثرت صور تیں جمع کرنا نظام کے فہم کے لیے حجاب بن جاتا ہے-بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سلسلہ نظم کو چھوڑنا کثرت تاویل کا سب سے بڑا باعث بنا ہے- کیونکہ نظم ہی وہ چیز ہے جو کلام کو صحیح رخ پر رکھتی ہے- سلف کا طریقہ یہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک نے صرف ایک تاویل اختیار کی، انہوں نے زیادہ تاویلوں کو جمع نہیں کیا- بعد کے لوگوں نے اختلاف اقوال کو رواج دیا- یہ معاملہ ہر علم کے ساتھ ہوتا ہے- جب کتابیں زیادہ ہو جاتی ہیں، علم مدون ہو جاتا ہے اور اس کا سیکھنا آسان ہو جاتا ہے تو لوگ تبحر اور کمال کی حرص میں ایک ہی فن میں تحقیق کو چھوڑ بیٹھتے ہیں- وہ کثرت اقوال و مذاہب ہی کو علم سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ طلب الکل فوت الکل کے مقولہ کے مطابق انہیں اس طرح علم حاصل نہیں ہوتا- علم تفسیر میں جو شخص مشغول ہوتا ہے وہ اسے اقوال کا ایک سمندر پاتا ہے- اگر وہ ان اقوال کی محافظت کے در پے ہو جائے تو تلاش نظم کے لیے ایک تو آدمی کے پاس فرصت نہیں رہتی، دوسرے بے شمار پہلوؤں کے سامنے آنے سے نظام کلام کی وحدت گم ہو جاتی ہے- لہذا ضروری ہوتا ہے کہ آدمی ایسی کتابوں سے اجتناب کرے اور سلف کے طریقہ پر خود قرآن پر غور کرے اور سنت ثابتہ کے ساتھ اس کی مطابقت تلاش کرے- اس کے نتیجہ میں نظم سمجھ میں آئے گا اور تاویل صحیح ہو گی-

چوتھا سبب جو تیسرے سبب سے قریب ہی ہے، یہ ہوا کہ امت فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئی تو ہر ایک فرقہ نے اپنے اپنے مسلک کی تائید میں کلام الٰہی سے دلیل لینی چاہی- وہ چاہے ظاہر کلام سے اپنے مطلب کی تاویل لے لیتے یا کلام کے مختلف امکانی معانی میں سے کسی ایک معنی سے مطلوبہ نتیجہ نکال لیتے، ان کے لیے برابر تھا- یہ بات پوشیدہ نہیں کہ رائے یا وہم کا غلبہ ایک بعید چیز کو قریب اور کمزور کو قوی بنا دیتا ہے- جب ہر فریق نے اپنے اپنے مقصد کے مطابق تاویل کرنا چاہی تو نظم کی رعایت ممکن نہ رہی، کیونکہ ہر کلام کا تو بہر حال

ایک سیاق ہوتا ہے اور اجزائے کلام کا ایک خاص موقع ہوتا ہے۔اگر یہ لوگ نظم کی رعایت کرتے تو کلام کے سیاق سے ہٹ جانے کے باعث ان کے نقطہ نظر کا ضعف واضح ہو جاتا، اس کی مثال یوں ہے جیسے ایک کلمہ جب تک الگ رہے تو اس کے کئی معانی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن جب اسے ایک کلام میں جگہ دی گئی ہو تو اس کے معانی کے احتمالات کی کثرت ختم ہو جاتی ہے اور اس کے وہ معانی متعین ہو جاتے ہیں جو جملہ کے مجموعی مضمون سے مطابقت رکھتے ہوں۔(ر: ۳۴-۳۸)

نظم قرآن کے قائلین کی شہادت:

نظم قرآن کی سب سے بڑی شہادت ان لوگوں کا علم و یقین ہے جن پر حسن ترتیب کے محاسن کچھ بے نقاب ہو گئے ہیں اور جنہوں نے ان حقائق کی کوئی تجلی دیکھ لی ہے جو نظم قرآن کے اندر ودیعت ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ کتاب اللہ کے اسرار و عجائب کا کیسا عظیم الشان خزانہ ہے جس کی کلید صرف نظم ہے۔ یہ چیز ان کے ذوق جستجو کو شہ دیتی اور ان کی طمانیت و بصیرت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس مخفی خزانہ کو اجاگر کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی کو بامراد کرتا ہے اور جتنا ان کے مقدر میں ہوتا ہے وہ اس میں سے پا جاتے ہیں۔ جو دروازے کھلتے جاتے ہیں ان کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوتے ہیں اور جو دروازے نہیں کھلتے ان کو وہ اپنی قلت علم و نارسائی فہم پر محمول کرتے ہیں۔ کیونکہ معلوم ہے کہ کتاب الٰہی ایک سمندر ہے جس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ کوئی شخص آفتاب کو اپنے احاطہ میں نہیں لا سکتا اور نہ کوئی شخص قرآن کے معاملہ میں کبھی غلطی سے محفوظ ہو سکتا۔ لیکن یہ چیز ان کے شوق و طلب کی سرگرمی کو کمزور نہیں کرتی بلکہ ان کا ذوق جستجو برابر مشتعل رہتا ہے اور وہ اس محنت سے جتنا کچھ بھی پاتے ہیں اس کی قدر کرتے ہیں، چنانچہ جس نے بھی اس علم میں سے کوئی حصہ پایا ہے اس نے اس نعمت عظمیٰ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا ہے۔ امام سیوطی اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں کہ:-

"پہلے شخص جنہوں نے علم مناسبت (علم نظم) کو ظاہر کیا شیخ ابو بکر نیشاپوری ہیں- فقہ و ادب میں ان کا بڑا مرتبہ تھا- ان کے لیے منبر رکھا جاتا جس پر بیٹھ کر وہ قرآن کی آیتوں کی شرح کرتے اور بتاتے کہ فلاں آیت فلاں آیت کے پہلو میں کیوں رکھی گئی اور فلاں سورت کے فلاں سورت کے ساتھ رکھنے میں کیا حکمت ہے، اور علمائے بغداد کی تنقیص کرتے کہ یہ لوگ نظم کے علم سے بالکل محروم ہیں"-

امام سیوطی نے ابن عربی کا بھی مندرجہ ذیل قول نقل کیا ہے :-

"آیات قرآن کے باہمی تعلق کو اس طرح سمجھنا کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کلام کے قالب میں ڈھل جائیں ایک عظیم الشان علم ہے- صرف ایک عالم نے اس علم سے تعرض کیا ہے- اسی اصول پر اس نے پوری سورہ بقرہ کو منظم کر دیا ہے- پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے ہم پر یہ دروازہ کھولا- لیکن ہم نے لوگوں کے اندر اس علم کے قدردان نہیں پائے- ساری دنیا دوں ہمتوں اور کاہلوں سے بھری ہوئی ہے- پس ہم نے اس کو مہر بند ہی رکھا اور اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کے اس معاملہ کو اسی کی طرف لوٹا دیا"-

یہی حال امام رازی کا ہے وہ بھی جگہ جگہ تفسیر میں اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں- مخدوم مہائمی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا موضوع ہی نظم ہے- انہوں نے اس نعمت کی عظمت کا جن لفظوں میں اعتراف کیا ہے اور اس کے مقابل میں اپنی بے مائیگی اور آلودگی کا جس درجہ ان کو احساس ہے وہ ان کی تفسیر کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں ہے- وہ اس علم کو محض فضل الٰہی کی بخشش قرار دیتے ہیں اور اسی احساس کے ماتحت انہوں نے اپنی کتاب کا نام تبصیر الرحمان و تیسیر المنان رکھا ہے-

جن لوگوں نے اس علم میں سے کوئی حصہ پایا ان کی نگاہوں میں اس کا یہ درجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اعترافات ان کی زبانوں سے اسی وقت نکلے ہوں گے جب کہ انہوں نے محسوس کر لیا ہو گا کہ قرآن مجید کی آیتیں ایک نادر اسلوب کے ساتھ مرتب ہیں۔ جیسا کہ شیخ ولی الدین ملوی نے کہا ہے:

> "جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیتوں میں اس لیے نظم نہیں تلاش کرنا چاہیے کہ وہ مختلف وقتوں میں مختلف حالات کے ماتحت نازل ہوئی ہیں، وہ غلط کہتے ہیں۔ ٹھیک بات یہ ہے کہ وہ نزول کے پہلو سے تو واقعات کے لحاظ سے ہیں لیکن ترتیب کے پہلو سے بالکل مطابق حکمت ہیں"۔

اور ظاہر ہے کہ جو شخص قرآن کے اندر اس کی مہک پا رہا ہو، اس کے جلوے دیکھ رہا ہو اور اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھو رہا ہو وہ اس چیز کا انکار کیسے کر سکتا ہے؟ ہاں جس نے اس کا مزہ ہی نہ چکھا ہو وہ اگر اس کا انکار کر دے تو وہ کچھ قابل الزام بھی نہیں۔

جو چیز مجھے لوگوں کے سامنے لائی ہے اس کے متعلق اس طویل بیان کی چنداں ضرورت نہیں تھی، لیکن میں نے یہ تمہید اس لیے ضروری سمجھی کہ نظم کی جستجو تدبر کی محتاج ہے اور اگر تمہارے دماغ میں یہ بات جاگزیں ہے کہ قرآن مجید میں نظم سرے سے ہے ہی نہیں تو اس رائے کے ساتھ اس دشوار گزار وادی میں ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہو گا۔ ہر چیز تمہیں بے گانہ معلوم ہو گی اور اس میں سر کھپانا طبیعت پر بہت بار ہو گا۔

ایک بات تم البتہ پوچھ سکتے ہو کہ اگر نظم ایسی ہی عظیم الشان اور کثیر المنفعت چیز تھی تو آخر صحابہ نے اس کے متعلق کیوں سکوت اختیار فرمایا اور نبی ﷺ نے اس کی توضیح کیوں نہیں فرمائی؟ ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ آیات کا موقع و محل صحابہ کے سامنے بالکل واضح تھا۔ وہ تمام تر انہی کے حالات اور انہی کے پیش نظر معاملات سے متعلق تھیں۔

اگر ہم بھی اس مبارک زمانہ میں ہوتے تو ان کا نظام ہمارے لیے بھی بالکل واضح ہوتا- چنانچہ یہی وجہ ہے کہ صحابہ سے تفسیر بہت کم منقول ہے- زبان ان کی تھی، اسلوب ان کے تھے اور معاملات و حالات ان کے تھے- ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہو- پھر نظم کے سمجھانے میں ہمارا اور ان کا حال یکساں کیسے ہو سکتا ہے ؟ لیکن اس نمایاں فرق کے باوجود یہ ضرور ہے کہ کلام کی لپیٹ اور اس کی تہوں کے اندر ایسے اشارات موجود ہوتے ہیں جو آگے کی طرف انگلی اٹھاتے رہتے ہیں- اور اگر آدمی کند ذہن نہ ہو بلکہ کلام کے تمام اطراف میں پھیل کر آگے بڑھنے کا عادی ہو تو یہ اشارات نظم کو بے نقاب کرتے رہتے ہیں-(م :۳۱-۳۲)

قرآن میں نظم کے دلائل :

خود قرآن اپنے مرتب و منظم ہونے پر کئی پہلوؤں سے دلیل فراہم کرتا ہے-مثلاً :

الف- ایک آیت کئی مضامین کو جمع کیے ہوئے ہوتی ہے اور کبھی متعدد جملوں پر بھی مشتمل ہوتی ہے لیکن ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس آیت کے غیر منظم ہونے کا گمان بھی کرے- ذرا سے غور کے بعد اس کا نظام سمجھ میں آجاتا ہے جو آیات کے مجموعوں کا نظام سمجھنے کے لیے مثال اور نمونہ کا کام دیتا ہے- آیات کے مجموعوں کا یہ نظام سورہ کے طویل حصوں کے نظام کو سمجھنے کے لیے مثال فراہم کرتا اور پوری سورہ کے نظام تک رسائی کا ذریعہ بن جاتا ہے- ایک آیت یا آیتوں کے مجموعوں کے نظام ہی کے مشابہ سورتوں کا آپس کا نظام بھی ہے- لہذا جو شخص ایک آیت کے اندر نظم کا اقرار کرتا ہے، جس کے مانے بغیر کوئی چارہ نہیں، تو اس کے لیے اس کے سوا بھی کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ آیات کے مجموعوں اور پھر سورتوں کے نظم اور ان کے بیچ ربط کا اقرار کرے- کیونکہ ان کے ربط کی نوعیت ایک جیسی ہے-

ب- قرآن مجید کے ایک مقام پر مضامین میں جو ربط نظر آتا ہے وہ کئی دوسرے مقامات پر

بھی ملحوظ ہوتا ہے- جب تم اس ربط کی مناسبت پر غور کرو گے تو اس کی حکمت تک پہنچ جاؤ گے- مثال کے طور پر قرآن میں بار بار نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا، ربا کے ساتھ صدقہ کا، مالی قربانی کے ساتھ جانی قربانی اور نماز کا، صبر کے ساتھ نماز کا، جہاد کے ساتھ ہوائے نفس سے اجتناب کا، نماز کے ساتھ سخاوت اور قربانی کا، تقویٰ کے ساتھ ایمان، احکام شریعت اور قسط کا اور قسط کے ساتھ توحید، معاد اور احکام شریعت کا مضمون دیکھو گے- غور کرنے سے ان مضامین کی باہمی مناسبت سمجھ میں آجاتی ہے اور کہیں کہیں تو اس مناسبت کو واضح بھی کر دیا گیا ہے- یہ چیز نظام کی طرف رہنمائی تو کرتی ہی ہے، اس کے علاوہ یہ حکمت کے ابواب تک بھی رہنمائی کرتی ہے- کیونکہ حکمت نظام کے ساتھ پیوست ہے-

ج- قرآن کا یہ بھی طریقہ ہے کہ وہ ایک مقام پر کچھ ایسے امور کا ذکر کر دیتا ہے جن کی مناسبت بالکل واضح ہوتی ہے- پھر دوسرے مقام پر کچھ مناسبتوں کو باقی رکھ کر باقی مناسبتوں کا ذکر نہیں کرتا- جس شخص کی نظر پہلے مقام پر ہوتی ہے جس میں مناسبتوں کا بیان موجود ہوتا ہے وہ دوسرے مقام پر خود بخود خلا کو بھر دیتا ہے- اور غیر مذکور مناسبتوں کی طرف اس کی توجہ ہو جاتی ہے- قرآن کا یہ انداز بھی ہے کہ وہ ایک پہلو دار بات کا ذکر مختلف مقامات پر اس طرح کرتا ہے کہ ہر مقام پر اس کے بعض پہلوؤں کو نمایاں کرتا جاتا ہے- تمام پہلو یکجا بیان نہیں ہوتے- (ر: ۴۰-۴۱)

د- یہ نظم کلام ہی کا تقاضا ہے کہ انسانی فطرت کے ضعف کے سبب سے، جیسا کہ ولقد عهدنا الى آدم من قبل فنسى و لم نجدله عزما- (طہ: ۱۱۵) (اور ہم نے آدم سے اس بات کا اس سے پہلے عہد لیا تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی) میں بیان ہوا ہے، جو آیتیں بطور تخفیف کے نازل ہوئیں ان کو اصل احکام کے پہلو میں جگہ دی گئی ہے- اس کی تصدیق الئن خفف الله عنكم و علم ان فيكم ضعفا (انفال: ۶۶) سے ہوتی ہے- یہ آیت اپنے اصل سابق حکم کے پہلو میں رکھی گئی ہے- سورہ مزمل کی آخری آیت اس کی ابتدائی

آیات کے بعد نازل ہوئی ہے لیکن رکھی وہیں گئی جہاں اس سلسلہ کے سابق احکام موجود تھے۔ یہی حال احل لکم لیلة الصیام الرفث (بقرہ : ۱۸۷) کا ہے۔ اسی طرح آیت والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا (بقرہ : ۲۴۰) اس سلسلہ کے اصل احکام کے بعد بطور تتمہ نازل ہوئی اور غایت اہتمام کی وجہ سے پہلے تتمہ کے بعد رکھی گئی۔ اس طرح کی توضیحی و تشریحی آیات کے بعد بالعموم یہ آیت آیا کرتی ہے و کذلک یبین اللہ ایاتہ للناس (اور اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت اس وعدہ کا ایفا ہے جو اللہ تعالٰی نے سورہ قیامہ آیت ۱۹ میں فرمایا ہے۔ ثم ان علینا بیانہ (پھر ہمارے اوپر اس قرآن کو واضح کرنا ہے) اور اس دعا کا جواب ہے جو سورہ طٰہٰ آیت ۱۱۴ میں مذکور ہے کہ رب زدنی علما (میرے پروردگار میرے علم کو زیادہ کر)

ہمارا یہ استنباط قرآن سے تھا۔ بعینہ اسی بات کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت اترتی، نبی ﷺ حکم دیتے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھا جائے اور وہ اسی جگہ رکھی جاتی۔ اسی طرح یہ بھی روایات میں آتا ہے کہ جب ایک سورہ تمام ہو جاتی تو حضرت جبریل امینؑ آنحضرت ﷺ کو پوری سورہ از سر نو سنا دیتے۔ ہمارے نزدیک یہی وہ جمع کرنا اور پڑھنا ہے جس کا ذکر سورہ قیامہ میں ہوا ہے اور جس کی پیروی کا آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا تھا۔

علاوہ ازیں یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ جہاں تک قرآن مجید کی آیتوں کی ترتیب کا تعلق ہے اللہ تعالٰی کی مہربانی سے اس بارہ میں امت کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مسلمانوں کے جس قدر فرقے ہیں سب کے پاس قرآن مجید اسی ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔ (م : ۳۰-۳۱)

اصول تفسیر کو مدون کرنے کی ضرورت

تفسیر صدر اول میں :

قرآن حکمت اور معارف کے ایسے خزانے اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جن کا احاطہ اللہ تعالٰی کے سوا کسی کے بس میں نہیں۔ان خزانوں تک رسائی کے لیے قرآن نے متعدد آیات میں کتاب اللہ میں غور و فکر کو واجب قرار دیا۔ تعلیم قرآن نبی ﷺ کے فرائض میں بھی داخل تھی۔اس لیے آنحضرت ﷺ نے غور و فکر اور نتائج اخذ کرنے کے طریقوں کی تعلیم بھی دی۔ قرآن کی تفسیر کے ضمن میں خود نبی ﷺ سے بہت کچھ منقول ہے۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں ان کے تقویٰ، زبان دانی اور شان نزول کے علم کے باعث آیات کی تاویل بالعموم ایک ہی تھی۔ان کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ بہت سے صحابہ جب قرآن کی تفسیر بیان کرتے تو وہ علم کا ایک سمندر نظر آتے اور ان کے بیان کردہ نکات موسلادھار بارش کی مانند ہوتے۔وہ بیان کرتے تو ساتھیوں کے سینوں کو علم و حکمت سے بھر دیتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے سامعین وہ سب کچھ جو انہوں نے صحابہ کرام سے سنا، پچھلوں کو منتقل کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔اس لیے صحابہ کرام سے تفسیر قرآن کے طور پر جو کچھ مروی ہے اس کی مقدار بہت کم ہے۔البتہ راویوں نے اس پر اضافہ تابعین اور تبع تابعین کے اقوال سے کیا ہے۔(ر :۲۲۱-۲۲۹)

صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم کے ہاں آیات کی تاویل میں کہیں کہیں اختلاف رائے واقع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تاویل نبی ﷺ سے ماخوذ نہ تھی۔اگر ایسا ہوتا تو اس میں اختلاف کا پایا جانا محال تھا۔ان کے ہاں تاویل کے اختلاف کا سبب یہ ہے کہ قرآن خود بے شمار پہلوؤں کا جامع ہے۔اس کے علاوہ لوگوں کے اپنے عقلی مدارج میں بھی

اختلاف پایا جاتا ہے- یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے فتویٰ میں بھی اختلاف موجود پاتے ہیں- اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحابہ و تابعین نے قرآن کی تفسیر خالص رائے کی روشنی میں اور نفسانی خواہشات کے تحت کی بلکہ ان کی اختیار کردہ تاویل علم صحیح اور نظر صحیح کے مطابق تھی- وہ ان تاویلات تک ایک تو اپنی زبان دانی کے ذریعہ پہنچے، دوسرے انہوں نے نظائر آیات کا سہارا لیا اور تیسرے سنت کا علم ان کا ممد و معاون ہوا- ان وسائل کے ساتھ ساتھ تاویل انہوں نے اس بصیرت کی روشنی میں کی جو اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عطا فرمایا کرتا ہے- ان کے تفسیری نکات جمع کرنے والوں نے ان کے تدبر کے اصول جمع نہیں کیے- اگر ہمیں ان اصولوں تک رسائی حاصل ہو سکتی تو کتاب اللہ پر غور کرنے کے لیے ہمیں ایک عمدہ نمونہ میسر آجاتا-

تفسیر میں الجھاؤ کے اسباب :

تابعین سے بعض شان نزول مخفی رہ گئے تو انہوں نے قرآن کی تاویل آیات اور آثار صحابہ کی روشنی میں کی- اس میں انہوں نے گویا دو بنیادوں کا سہارا لیا- ایک یہ کہ قرآن کا کوئی حصہ دوسرے حصے کا مخالف نہیں ہے- دوسری یہ کہ نبی ﷺ کے اقوال و افعال اور صحابہ کرام کا عمل قرآن کے موافق تھا- اس دور میں جو اختلاف پیدا ہوا وہ ایک ہی معنی کے دو مختلف پہلو مراد لے لینے کے باعث پیدا ہوا- ایسا مفہوم حقیقت سے دور نہیں لے جاتا- البتہ اس دور میں ضعیف روایات بکثرت پھیل گئیں اور لوگوں نے تفسیر میں ان پر اعتماد کر لیا- یہیں سے تفسیر کی کتابوں میں یہودیوں اور دجالوں کی موضوع روایات کو داخل ہونے کا موقع ملا- اس کے بعد جب اہل سنت نے دیکھا کہ بدعت اور باطل کے علم بردار قرآن کی تاویل اپنی خواہش کے مطابق کرنے لگے ہیں اور وہ قرآنی نصوص کو وہ معانی پہناتے ہیں جو اصل میں مراد نہیں ہیں تو انہوں نے صحابہ و تابعین سے مروی تفسیر کے علاوہ دوسروں کے تفسیری اقوال میں دلچسپی لینے سے اجتناب کیا- اس میں شک نہیں کہ انہوں نے یہ کام فتنہ

کے دروازے بند کرنے کے لیے کیا اور اس کا طریقہ تھا بھی یہی، کیونکہ جب تک تاویل کی بنیاد ایسے قواعد پر نہ رکھی جائے جو حق اور باطل کو الگ الگ کر دیں تو یہ محض رائے پر مبنی تفسیر کی راہ نہیں روک سکتی۔

اس کے بعد وہ دور آیا جس میں فلسفہ کا زور ہوا اور عقائد میں اختلاف رائے سامنے آیا۔ اس دور میں لوگوں نے کلامی انداز میں کتابیں تصنیف کیں اور خیال کو بے قابو کر دیا۔ ہر فرقہ نے روایات اور فلسفہ میں سے اس چیز کو لے لیا جو اس کو پسند آئی۔ اس کے نتیجہ میں تاویل کے اتنے متعدد پہلو سامنے آئے کہ واضح امور بھی مشتبہ نظر آنے لگے۔ اب تفسیر کی راہیں تاریک اور قرآن کا دروازہ بند ہو گیا۔ راویوں کی کثرت اور روایات کے اختلاف کے باعث فیصلہ کن صحیح تاویل گم ہو گئی۔ (ر: ۲۲۹)

سیاسی ضرورت کے تحت بھی قرآن کی نہایت کمزور تاویلات کی گئیں اور بحث کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ اسلام میں حکومت کا آغاز نبوت اور خلافت راشدہ کی آغوش میں ہوا تھا۔ لوگ تمام فیصلے کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی روشنی میں کیا کرتے اور اس سے ہرگز پہلو تہی نہ کرتے۔ چنانچہ سیاسی ضابطوں کی بنیاد بھی اللہ کے حکم پر رکھی گئی۔ بعد میں جب خلافت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی جو بادشاہوں کے مشابہ تھے تو ان پر بھی احکام شریعت کی اتباع لازم تھی۔ سو وہ مجبور ہوئے کہ جزوی احکام کی تدوین کے لیے علماء کی خدمات حاصل کریں۔ علماء کے لیے یہ ذمہ داری آسان نہ تھی کہ وہ اپنے پاس سے نئے نئے فیصلے کرتے رہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تکمیل کا اعلان فرما دیا تھا۔ مزید براں نبی ﷺ اور آپ کے خلفاء نے بھی عملاً دکھا دیا تھا کہ ہر معاملے میں شریعت کو کیسے لازم پکڑنا ہے۔ چنانچہ ان علماء نے قرآن اور نبی ﷺ سے مروی احادیث پر قیاس اور رائے کے استعمال کی راہ اختیار کی لیکن یہ کام اختلاف روایات کے باعث ان کے لیے ایک بھاری بوجھ ثابت ہوا۔ ان میں سے بعض علماء اکثر محدثین کی طرح تنقید کے بعد احادیث کی طرف سے مطمئن ہو

گئے-اس کا سبب ان کا یہ علم تھا کہ پیغمبر کا کلام قرآن کے موافق ہونا لازم ہے-اسی طرح صحابہ کا کلام پیغمبر کے کلام کے مطابق ہونا لازم ہے- چنانچہ ان کو احادیث میں سہولت نظر آئی-اس میں خطرہ کم تھا-انہوں نے حدیث کو اصل مان لیا اور اس کی مدد سے قرآن کی تفسیر کی-اس طرح قرآن کی باگ حدیث کے ہاتھ میں چلی گئی-اب انہیں قرآن کا حقیقی مفہوم سمجھنے سے دلچسپی نہ رہی اور انہوں نے قرآن کی تاویل، اس کی آیات کے مفہوم کے خلاف کر دی- حالانکہ صحیح طرز عمل یہ تھا کہ وہ احادیث کی تاویل قرآن کی روشنی میں کرتے کیونکہ قرآن ایک مرکز کی مانند ہے، احادیث مختلف جہتوں سے اس کی طرف رخ کرتی ہیں- بظاہر متضاد روایات کی تاویل اگر قرآن کی روشنی میں کی جائے تو وہ ایک دوسرے کے موافق ہو جاتی ہیں-(ر :۲۳۱)

مذکورہ اسباب کے علاوہ دو اور خاص پہلو ایسے ہیں جن کے باعث تفسیر غلط ہوتی ہے :

۱- جب سے امت محمد ﷺ نے مذہب میں فرقہ واریت اختیار کی ہے ہر فرقہ نے ایک خاص مذہب اختیار کر لیا ہے جو فروعات میں دوسرے فرقہ سے بالکل الگ ہے-اس نے یہ بھی مان لیا ہے کہ اگر اس فرقہ کے مذہب کی مخالفت میں کچھ کہا جائے گا تو وہ باطل محض ہو گا- چنانچہ تمام فرقوں نے قرآن کی تاویل بھی اپنے اپنے مذہب کے مطابق کر دی-وہ قرآن کی طرف دل کی سادہ لوح کے ساتھ نہیں آئے-اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفسرین کی تفسیریں ایک دوسرے کے مخالف ہو گئیں-ایک مفسر کے لیے واجب ہے کہ تفسیر کرنے سے پہلے وہ کوئی مخصوص مذہب نہ رکھتا ہو-ایک مقلد کے لیے قرآن میں غور کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے-

ے پاک شو اول وپس دیدہ بر آں پاک انداز

۲- متکلمین کا رجحان یہ ہے کہ وہ ہر اس حقیقت کا انکار کر دیتے ہیں جو ان کے نقطہ نظر کے خلاف دلیل بنتی ہے-وہ کسی چیز کا توڑ کرنے کے لیے سب سے قوی ذریعہ اختیار کرتے ہیں اور یہ قوی ترین ذریعہ اس چیز کا انکار ہے- چنانچہ دیکھو گے کہ ابو مسلم ۸

اور سید احمد نے قرآن میں نسخ کا انکار کر دیا۔ حجۃ اللہ البالغہ کے مصنف کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ اسی طرح سید احمد نے جب دیکھا کہ ظاہر قرآن کے لحاظ سے حضرت محمد ﷺ کے لیے معجزہ کی نفی ثابت ہوتی ہے اور حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کو اس اعتبار سے حضورؐ پر فوقیت حاصل ہوتی ہے تو انہوں نے معجزہ ہی کا انکار کر دیا۔ (ر: ۱۳۸-۱۳۹)

نظم کی رعایت کے بغیر تفسیر اختلاف کا باعث ہے:

ہم یہ دکھانے کے لیے کہ نظم کا لحاظ کیے بغیر کسی آیت کی تاویل کس طرح مختلف ہو جاتی ہے اور نظم کی رعایت کیسے اس کو واضح کر دیتی ہے، ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ سورہ نور کی آیت ۶۳ لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا (تم لوگ رسول کے بلانے کو اس طرح کا بلانا نہ سمجھو جس طرح تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو) کے تحت امام رازیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اس آیت کے مفہوم کے کئی پہلو ہیں۔ مبرد اور قفال نے جس پہلو کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ تمہیں جو حکم دیں اور تمہارے لیے جو دعا کریں اس کو وہ حیثیت نہ دو جو تم آپس میں ایک دوسرے کے حکم یا دعا کو دیتے ہو۔ کیونکہ ان کا حکم ایک فرض لازم ہے۔ جو چیز اس مفہوم کی دلیل فراہم کرتی ہے وہ اس کے بعد کا جملہ فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ (پس جو لوگ اس کے حکم سے گریز کرتے رہے ہیں اس بات سے ڈریں کہ -------) ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ کو اس طرح نہ پکارو جیسا تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ یعنی یا محمدؐ اور یا ابالقاسم مت کہو بلکہ یا رسول اللہ اور یا نبی اللہ کہا کرو۔ یہ تاویل سعید بن جبیر کی ہے۔

اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ کو پکارنے میں اپنی آوازیں بلند نہ کرو۔ گویا اس آیت کی مراد بھی وہی ہے جو آیت ان الذین یغضون اصواتهم عند رسول

اللہ ---الآیہ کی ہے- یہ تاویل ابن عباس کی ہے-

اس کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بد دعا سے بچو جس کا وبال ان کو ناراض کرنے کی صورت میں تم پر آپڑے گا- ان کی بد دعا دوسرے لوگوں کی بد دعا کی طرح نہ ہو گی- ان میں سے پہلی تاویل آیت کے نظم سے قریب تر ہے"-

امام صاحب نے اس تاویل کو قابل ترجیح قرار دیا ہے جس کے متعلق ان کا خیال یہ ہے کہ اس میں نظم قرآن کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے-

ہمارے خیال میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ جب تمہیں بلائیں تو لازم ہے کہ ان کے پاس آؤ، خواہ وہ بلانا تمہارے حق میں ہو یا تمہارے خلاف، اور ان کی بات سنو اور اس کی تعمیل کرو- جب تک رسول اللہ اس معاملہ کا فیصلہ نہ کر دیں جس کے لیے انہوں نے تم کو طلب کیا ہے، اس وقت تک ان کے پاس سے رخصت نہ ہونا کیونکہ آنحضرتؐ کے حکم کی مخالفت گناہ ہے- آیت کے اس مفہوم کے حق میں پوری آیت کا مضمون دلیل مہیا کر رہا ہے- پوری آیت یوں ہے-

لا تجعلوا دعاء الرسول كدعاء بعضكم بعضا قد يعلم الله الذين يتسللون منكم لو اذا فليحذر الذين يخالفون عن امره ان تصيبهم فتنة او يصيبهم عذاب اليم-

(تم لوگ رسول کے بلانے کو اس طرح کا بلانا نہ سمجھو جس طرح تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو- اللہ تم میں سے ان لوگوں سے اچھی طرح باخبر رہا ہے جو ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک جایا کرتے رہے ہیں- پس جو لوگ اس کے حکم سے گریز کرتے رہے ہیں اس بات سے ڈریں کہ ان پر کوئی آزمائش آ جائے یا ان کو ایک دردناک عذاب آپکڑے)

ہماری بیان کردہ تاویل کے حق میں ایک واضح دلیل اسی سورہ کی آیات ۴۷ تا ۵۲

ہیں- ممکن ہے مبردؒ اور قفالؒ کے پیش نظر بھی یہی بات رہی ہو اور امام رازیؒ نے اس کو نہ سمجھا ہو-(ر: ۵۳)

مشہور کتب تفسیر کی حیثیت

مشاہیر نے جو تفاسیر مرتب کی ہیں ان میں سے ہر تفسیر کا ایک خاص مقصد ہے-لہذا ان میں وہ چیز تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے جو ان میں نہیں ہے-ان تفاسیر کے ہر قاری کے لیے ان کے انداز اور مقصد کو جاننا لازم ہے-

ابن جریر رحمہ اللہ کی تفسیر ہر اس چیز کی جامع ہے جو نقل کے ذریعے ان تک پہنچی-وہ روایات پر تنقید نہیں کرتے البتہ تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد یہ ظاہر کر دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک درست مفہوم کیا ہے- جہاں ممکن ہوتا ہے وہ ایسا مفہوم متعین کر دیتے ہیں جو روایات کے ذریعے پہنچنے والے مفاہیم کا جامع ہو-وہ لغت اور اعراب کی بحث بھی کرتے ہیں جس میں ان کا اعتماد کلام عرب پر ہوتا ہے-ان خصوصیات کی بناء پر علماء کے ہاں اس تفسیر کو قبول حاصل ہوا ہے- روایات پر مبنی تفاسیر میں سب سے اچھی تفسیر یہی ہے اور اس کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس کی مانند کوئی دوسری تفسیر تصنیف نہیں کی گئی- جہاں تک قرآن کی روشنی میں روایات کو پرکھنے یا عقل اور تاریخ کے حوالے سے ان پر غور کرنے کا تعلق ہے یہ چیز اس تفسیر میں نہیں ملتی بلکہ نہایت ہی مجہول باتیں اس میں جمع ہو گئی ہیں جن پر امام صاحب نے توجہ دلانا بھی ضروری نہیں سمجھا- یہ کام انہوں نے اہل نظر کے لیے چھوڑ دیا ہے-اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو شاید اس عظیم تفسیر کو مکمل کرنا ان کے لیے آسان نہ ہوتا-

تفسیر ابن کثیر، ابن جریر کی تفسیر کا خلاصہ ہے-اس میں محدثین کے اصول پر روایات پر تنقید کی گئی ہے اور تاویل پر تنقید بھی اس میں شامل ہے-باقی رہی تنقید ان پہلوؤں سے جن کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے تو محدثین کی تفاسیر میں اس کی تلاش بے سود ہے-

تفسیر رازی، تفسیر ابن جریر کی مانند، اقوال کی جامع ہے- لیکن اس میں اقوال متکلمین

کے ہیں-اس میں قرآن کے بعض ایسے معارف واضح ہوئے ہیں جو اگرچہ آیات میں موجود تھے لیکن سلف سے مروی تفسیر میں وہ کہیں بیان نہیں ہوئے تھے- دوسری طرف امام صاحب نے قرآن کو ایک متشابہ کتاب قرار دیا ہے- ان کے نزدیک یہ ایسی گڈمڈ ہے کہ اس کے فہم کی کوئی امید نہیں ہوتی- اس کی وجہ ان کے نزدیک اس کی تاویل کے بکثرت پہلو ہونا ہے- جب کہ ہر قابل فہم کلام کا مفہوم ایک ہی ہوتا ہے- مزید براں رازی نے قرآن کی دلالت کو ظنی قرار دیا ہے- مثلاً آیت اذا جاء نصر الله والفتح میں وہ فتح سے مراد فتح مکہ، فتح طائف، فتح خیبر، فتح عام، فتح علوم اور فتح معقولات سب لیتے ہیں- امام صاحب ابن جریر کی طرح کہیں کہیں درست تاویل کو ترجیح دیتے ہیں اور اشاعرہ کے مذہب کی تائید کرتے ہیں- اس تفسیر کی بڑی خوبی اقوال متکلمین کا جامع ہونا ہے- چنانچہ ایک غور کرنے والا قاری اس میں سے تاویلات کو منتخب کر سکتا اور اس کی روشنی میں خود غور کر سکتا ہے- امام رازی غور و فکر میں بہت دور تک نہیں جاتے- اگر وہ ایسا کرتے تو اقوال کی کثرت ان کے ہاں ممکن نہ ہوتی- لہذا اس کی ان کے ہاں توقع نہیں رکھنی چاہیے- تفسیر کے اسی کمزور پہلو کے باعث ابن جریر کی طرح اس میں بھی غث و سمین، خلط ملط اور نہایت ہی بھونڈی باتیں داخل ہو گئی ہیں-

زمخشری اپنی تفسیر میں قرآن کی عبارت پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں- اس سے وہ ہٹنے نہیں پاتے- وہ لغت، اعراب، ربط کلام ہر چیز سے بحث کرتے ہیں- وہ کلام کو طول دیے بغیر معتزلہ کے مذہب کی تائید کرتے اور روایات بہت کم لاتے ہیں- اس تفسیر کی نمایاں خصوصیات میں اس کا مختصر ہونا اور لغت و اعراب کی تحقیق کی غلطیوں کا کم ہونا ہے- لہذا یہ تفسیر طالب علموں کے لیے زیادہ مفید ہے-(ر: ۲۱۶)

ابن جریر اور امام رازی کی تفاسیر کو مسلمانوں کے اندر قبول عام حاصل ہوا ہے- البتہ علماء کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ ان دونوں تفاسیر میں مضبوط اور کمزور دونوں قسم کی چیزیں

موجود ہیں-لہذا ایک قاری کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ ان تفاسیر کو تنقیدی نظر سے پڑھے-

الفاظ قرآن کی دلالت کے بارے میں امام رازی کے موقف کا جائزہ :

قرآن کی نص کے ذریعے ہمیں خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالٰی نے اپنی کتاب کو محکم بنایا اور اس کی آیات کی تفصیل و تبیین کی-اس نے قرآن کو قرآن مبین اور فیصلہ کن قول کا نام دیا ہے-اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ قرآن کے اندر کچھ آیات متشابہات ہیں جن کی حقیقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں-جب تفسیر قرآن میں اختلاف پیش آیا اور لوگوں نے ایک دوسرے کے قول کو رد کرنا شروع کیا تو اس سے یہ گمان ذہنوں پر غالب آگیا کہ قرآن اپنی دلالت میں قطعی نہیں اور کسی کلام کے بارے میں اس کی بنیاد نقل پر ہونے کے باعث کوئی یقینی فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہوتا- یہ بحث امام رازی نے اپنی تفسیر میں سورۃ آل عمران کی آیت ٦ کے تحت کی ہے-

اس کے بعد لوگوں کا معاملہ یہاں تک چلا گیا کہ جہاں انہوں نے اپنے دلائل کے مخالف کچھ آیات دیکھیں ان کو متشابہات قرار دے دیا-نتیجۃً ایک ہی آیت ایک فرقہ کے نزدیک محکم اور دوسرے فرقہ کے نزدیک متشابہ قرار پائی-امام رازی رحمہ اللہ نے لکھا :

"یہ ایک سنگین صورت حال ہے-اہل مذہب میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ آیات جو اس کے مذہب کے موافق ہیں محکم ہیں اور جو حریف کے مذہب کے موافق ہیں متشابہ ہیں- ایک معتزلی کے نزدیک آیت فمن شاء فلیومن و من شاء فلیکفر محکم اور آیت وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العلمین متشابہ ہے-اہل سنت کے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہے-پس لازم ہے کہ کوئی قانون ہو جس کا لوگ سہارا لیا کریں"-

اس کے بعد امام صاحب لسانی دلائل کے ظنی ہونے پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"اس مضبوط تحقیق کے بعد ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ جب یہ بات قطعی دلائل

سے ثابت ہو چکی کہ لفظ کو اس کے ظاہری معنی پر قائم رکھنا محال ہے تو قرآن
کی تاویل معین کرنے میں نکتہ طرازیاں کرنا جائز نہیں ٹھہرتا- یہی بات
ہمارے اس باب کا نچوڑ ہے اور اللہ ہدایت اور رہنمائی دینے والا ہے"-

امام صاحب کا یہ کہنا کہ یہ ایک سنگین صورت حال ہے کتنی سچی بات ہے- اسی طرح تاویل کے معین کرنے میں نکتہ طرازیوں کو جائز نہ ٹھہرانا کتنا پسندیدہ ہے- لیکن جب تک محکم کو متشابہ سے ممیز نہ کیا جا سکے فتنہ کا دروازہ تو کھلا رہا- بدترین صورت حال وہاں پیش آتی ہے جہاں ایک فرقہ کے ہاں محکم مانی جانے والی آیت دوسرے فرقہ کے ہاں متشابہ ٹھہرتی ہے- اہل سنت نے تو آیت لا يكلف الله نفسا الا وسعها کو بھی متشابہات میں شمار کیا ہے- چنانچہ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

"جب ایک مسئلہ قطعی اور یقینی ہو اس میں کمزور ظنی دلائل کے ساتھ کوئی
رائے دینا جائز نہیں- اس کی مثال آیت لا يكلف الله نفسا الا
وسعها میں ملتی ہے"-

اس کے بعد انہوں نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اپنے طور پر پانچ قطعی دلیلیں یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کی ہیں کہ اس طرح کی تکلیف تو واقعہ میں موجود ہے جب کہ آیت اس کی نفی کرتی ہے- اور نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد وہ نہیں ہو سکتی جو اس آیت کے ظاہر سے سمجھی جاتی ہے-

اس کے باوجود اگر ہمارے پاس اس مزعومہ قطعی دلیل تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہوتا تو ہم اس کی طرف مائل ہوتے اور وہ ہمارے درمیان فیصلہ کن ثابت ہوتی لیکن امام صاحب نے جس چیز کو قطعی دلیل اور برہان قرار دیا ہے وہ خود شدید بحث کی زد میں ہے- یہ کیا موقف ہوا کہ انہوں نے قرآن کو تو غیر قطعی قرار دے کر اس سے اپنی امیدیں توڑ لیں اور سہارا لیا تو ایسی برہان کا جو پینے والے کی پیاس ہی میں اضافہ کرتی ہے-

اب صورت حال یہ ہے کہ ہم اختلاف وانتشار میں الجھ کر رہ گئے ہیں- امام صاحب کی تجویز کردہ اس "قطعی دلیل" سے ناامید ہو جانے کے بعد اب وقت آگیا ہے کہ آغاز میں جس چیز سے ہم سوء ظن میں مبتلا تھے اب اس کے بارے میں حسن ظن سے کام لیں اور اس بات پر ایمان رکھیں کہ قرآن اپنی دلالت میں قطعی اور دوٹوک فیصلہ کرنے والا ہے-

(ر: ۲۳۳-۲۳۴)

قرآن کی دلالت قطعی ہے:

جہاں تک متشابہات پر گفتگو کا تعلق ہے تو ان کی حقیقت کو واضح کرنا ہم پر واجب ہے- یہ بحث اپنے مقام پر آگے آئے گی- بہر حال میرے نزدیک قرآن مجید بالکل قطعی الدلالت ہے- ہر آیت میں مختلف معانی کا احتمال محض ہماری قلت علم و تدبر کا نتیجہ ہے- جن علماء نے اپنی تفسیروں میں بہت سے اقوال نقل کر دیے ہیں ان کا منشا یہ ہے کہ آیت کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کو ہمارے سامنے رکھ دیں- اس میں سے قول راجح کا انتخاب انہوں نے ہماری تمیز پر چھوڑا ہے- پس یہ بات جائز نہیں ہے کہ ہم بغیر کسی ترجیح و انتخاب کے تمام رطب و یابس یاد کر چھوڑیں اور پھر حیرانی و سرگشتگی کی وادیوں میں ٹھوکریں کھاتے پھریں- مثال کے طور پر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر میں بقرہ کی آیت ۱۹۱ کے تحت لفظ فتنہ کے معنی دیکھو- انہوں نے اس کے پانچ معانی بتائے ہیں- ظاہر ہے کہ یہ سب صحیح نہیں ہیں- اقوال کی کثرت تو ایک طالب علم کو بالکل حیران و درماندہ کر دیتی ہے- بسا اوقات لوگ مجرد اقوال نقل کر دیتے ہیں، ان کے دلائل بیان نہیں کرتے- یہ ان اقوال کے کہنے والوں اور ان کے سننے والوں دونوں پر نہایت کھلا ہوا ظلم ہے- میں نے اپنی تفسیر نظام القرآن میں آیات کے معانی تفسیر کی کتابوں سے نہیں لیے ہیں بلکہ خود آیات پر ان کے سیاق و سباق اور ان کی مماثل آیات کی روشنی میں غور کیا ہے- اس طرح جب چند آیتوں کے معنی روشن ہو گئے ہیں تب میں نے تفسیر رازی یا تفسیر طبری اٹھائی ہے- ان میں کبھی تو ایسا ہوا کہ کوئی قول سلف کا

میرے موافق مل گیا، کبھی میں سلف کے قول کے بالکل قریب قریب پہنچ گیا اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ جو معنی میری سمجھ میں آئے تھے ان سے مجھے رجوع کرنا پڑا۔ اور ایسا بھی بارہا ہوا کہ کوئی مشکل ایسی پیش آگئی جس کے لیے مجھے عرصہ تک توقف کرنا پڑا۔ لیکن ہر حال میں اشکال و ابہام کو میں نے اپنے علم و فہم کی کوتاہی اور غلط راویوں کی عامیانہ تقلید ہی پر محمول کیا۔

اگر تم کو اس بات پر تعجب ہو کہ ایک بالکل کھلی ہوئی اور واضح چیز میں ابہام و اشکال کا کیا ذکر، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کثافت پر تمہاری نظر نہیں ہے جس کی تہوں پر تہیں ہمارے اوپر اوڑھا دی گئی ہیں۔ کتنے کھلے ہوئے حقائق ہیں جن میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن جن طبیعتوں پر تاریکی چھائی ہوئی ہے وہ ان کے دیدار سے محروم ہیں۔ وجود باری میں، اس کی وحدانیت و یکتائی میں، روح کی جسم پر حکومت میں، روز جزا میں، ایک صاحب بصیرت کے لیے کہاں شک کی گنجائش ہے؟ لیکن دیکھتے ہو کہ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو وجود باری اور توحید باری وغیرہ جیسے حقائق میں بھی شک کرتے ہیں، پھر دوسرے مسائل کا کیا ذکر۔ یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ جس طرح حواس کو بیماریاں لاحق ہوتی ہیں، اسی طرح عقل کو بھی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ اور جب وہ بیماریاں اس کو لاحق ہو جاتی ہیں تو واضح سے واضح حقیقت بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ باتیں عقل و حواس کو تندرست فرض کر کے کہی جاتی ہیں۔ تو جو عقل مبتلائے امراض ہو گی وہ ان کو کیسے سمجھ سکتی ہے؟ سورج چمک رہا ہے، شکر میٹھی اور سفید ہے، ایک سلیم الحواس انسان ان باتوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی شک نہیں کرے گا لیکن کیا ایک اندھے، ایک احول اور ایک تپ زدہ کا بھی یہی حال ہو گا؟ اللہ تعالٰی نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ قبول رشد و ہدایت میں سب کا حال یکساں نہیں ہو سکتا۔ قرآن شریف کی نسبت فرمایا ہے۔ ھدی للمتقین (یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے) دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

فاذا قرات القرآن جعلنا بینک و بین الذین لا یومنون

بالآخرة حجابا مستورا- (بنی اسرائیل-۴۵)

(جب تم قرآن سناتے ہو تو ہم تمہارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ایک کثیف پردہ ڈال دیتے ہیں)

سقراط کا قول مشہور ہے کہ نفس کو تمام حقائق معلوم ہیں لیکن اس پر نسیان طاری ہے۔ مولانا رومؒ کا مقولہ ہے کہ اپنے نفس کی تاویل کرو، قرآن کی تاویل نہ کرو- خواجہ حافظؒ کا ارشاد ہے کہ سب سے بڑا حجاب تمہارا نفس ہے، اس کو دور کرو- ان باتوں کا کیا مطلب ہے؟ بہر حال ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ قرآن نے ادائے مطلب کے لیے وہی اسلوب اختیار کیے ہیں جو سب سے زیادہ واضح، سب سے زیادہ اقرب اور سب سے زیادہ خوبصورت تھے- اور جہاں کہیں کسی اسلوب میں کوئی تصرف کیا ہے تو کسی اہم فائدے کے لیے کیا ہے- (م: ۴۵-۴۶)

تفسیر بالرائے کے باب میں علماء کا موقف:

قرآن میں تفکر و تدبر کی راہ میں ایک رکاوٹ یہ چیز بنی کہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ تاثر قائم ہو گیا کہ تفسیر قرآن میں کوئی قول اگر سلف سے مروی نہیں ہو گا تو وہ تفسیر بالرائے ہو گی اور ایسی تفسیر کرنا دین میں ممنوع ہے- اوپر ہم واضح کر چکے ہیں کہ آیات کی تاویل میں اختلاف صحابہ کرام اور تابعین کے ہاں بھی پایا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے قرآن میں تدبر و تفکر کو ممنوع نہیں سمجھا- اسی طرح امام رازی کی تفسیر میں بھی ایسے معارف قرآنی سامنے آئے ہیں جو سلف سے مروی تفسیر میں کہیں بیان نہیں ہوئے- لیکن یہ معارف قرآن کی آیات ہی سے ماخوذ ہیں- درحقیقت تفسیر بالرائے وہ ہے جس کی سند نہ قرآن میں ملتی ہو، نہ سنت میں اور نہ عربی زبان میں-

رہا علماء کا یہ قول کہ وہ تفسیر جو سلف سے منقول نہیں تفسیر بالرائے ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص منقول تفسیر کو ترک کر دے گا اس کے لیے عین ممکن ہے کہ اوہام میں مبتلا

ہو کر کسی باطل ہی کو عقل کے مطابق سمجھ کر اس کو اختیار کر لے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی بات انہوں نے فقہی امور میں کہی کہ جو شخص فتویٰ میں سلف کی تقلید نہیں کرتا اور اپنی عقل کے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے وہ جادہ شریعت سے دور نکل جانے سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ علماء کا یہ قول اس بات پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے کہ تفسیر میں اسباب نزول اور ان کے مواقع کو جہاں بیان کرنے کی ضرورت ہے وہاں ان کو لیا جائے۔ اس ضمن میں جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نقل سے جو کچھ لیا جائے اس کو تنقیدی نگاہ سے دیکھ لیا جائے اور وہی چیز اختیار کی جائے جو صحیح اور ثابت ہو۔ علماء کے اس قول کو ان معانی پر محمول نہیں کیا جائے گا کہ قرآن کی دلیلوں پر غور و فکر ترک کر دیا جائے یا آیات کو ان کے نظائر کی روشنی میں نہ دیکھا جائے یا جو چیز منقول مل جائے اس کے صحیح و سقیم میں امتیاز کیے بغیر اس پر اعتماد کر لیا جائے یا قرآن پر تدبر کی روش ترک کر دی جائے اور اس کے معانی نہ سمجھے جائیں۔ صحیح رویہ یہ ہے کہ سلف سے جو کچھ منقول ہے اس کو نگاہ میں رکھا جائے تاکہ جہاں اپنے نتائج فکر کے ساتھ موافقت پائی جا رہی ہو وہاں تائید حاصل ہو سکے اور جہاں مخالفت پائی جا رہی ہو وہاں دوبارہ سہ بارہ غور و فکر کیا جا سکے تا آنکہ خود کلام کے مفہوم پر دل مطمئن ہو جائے، کیونکہ کلام ہی سب سے زیادہ قابل اعتماد اور خطا سے پاک ہے۔ اسی لیے علماء نے یہ کہا ہے کہ بہترین تفسیر وہ ہے جو خود قرآن سے ماخوذ ہے۔ (ر: ۲۱۷)

تفسیر میں دوسرے علوم سے استفادہ :

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ نئے علوم مثلاً علم بیان، علم مناظرہ و استدلال میں مشغول ہونا بدعت ہے، کیونکہ ان لوگوں نے ان علوم سے کوئی سروکار نہیں رکھا جو دین کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اسی طرح کا ایک وہم یہ بھی ہے کہ ان علوم کے اصول پر اگر کوئی تاویل کسی قرآنی آیت کی کی جائے گی تو وہ محض رائے پر مبنی قرار پائے گی۔ صحابہ کرام ایسی تاویلات سے واقف نہ تھے۔ لہذا جو شخص کسی ایسے علم کا مدعی ہو جس سے صحابہ واقف نہ تھے

تو اس نے ایک باطل بات کہی۔ ایسے مدعی کے اکتشافات کی طرف توجہ کرنا مناسب نہیں۔ اس وہم میں پڑے ہوئے لوگ اس دلیل سے کتاب اللہ میں غور و فکر اور بحث و تمحیص سے روکتے ہیں اور اسی علم پر قناعت کرتے ہیں جو سلف سے منقول ہے۔ اس نقطہ نظر میں چونکہ حق اور باطل گڈمڈ ہو گئے ہیں اس لیے اس کی وضاحت کی ضرورت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نہ صرف فقہاء صحابہ بلکہ عام صحابہ بھی مختلف وجوہ کی بنا پر قرآن کا علم زیادہ رکھتے تھے۔ اس کو سمجھنے کے لیے نہ ان کو علم بیان اور اس کی مختلف شاخوں کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور نہ علم منطق و استدلال کی۔ ان کے ذوق اور سلامتی عقل نے ان کو ان علوم کا محتاج نہیں رہنے دیا۔ بیشتر ایسے علوم کی حیثیت حقیقت میں وہی ہے جو مریض کے لیے دوا کی ہوتی ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ علم عروض و بیان بہت سے اعلیٰ پائے کے شاعروں اور دنگ کر دینے والے خطیبوں کے گزر جانے کے بعد وجود میں آیا اور اس کو ان کے کلام کے اسالیب ہی کی روشنی میں مدون کیا گیا۔ اسی طرح علم نحو ان اہل زبان کے کلام سے ماخوذ ہے جو خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ علم مناظرہ کی بنیاد ارسطو نے رکھی لیکن اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی لوگ اصول منطق کو جانے بغیر بحث و استدلال کیا کرتے تھے۔ حقیقت میں منطق تو ہے ہی اس علم مناظرہ کا ایک قطرہ جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے۔

اس طرح کے علوم جن لوگوں نے پیدا کیے یا ان کی مدد سے نتائج اخذ کیے وہ افراط و تفریط کے باعث کبھی بھٹک جاتے ہیں اور اسی لیے ان میں اختلافات بھی پیدا ہوئے ہیں، اور وہ لوگ جو ان میں زیادہ دلچسپی لینے لگ جاتے ہیں وہ فطرت کی سلامتی سے دور ہو جاتے ہیں۔ علم عروض و منطق میں مشغول بہت سے لوگوں کی حالت تم یہی دیکھو گے۔ ہماری رائے اصول فقہ کے علم کے باب میں بھی یہی ہے۔ امت کے بڑے فقیہ اور اس علم میں گہری نظر رکھنے والے اس دور میں تھے جب ابھی یہ علم مدون نہیں ہوا تھا۔

خود اپنے اوپر غور کرو۔ایک شعر تمہیں بے حد متاثر کرتا ہے یا ایک خطبہ ہلا ڈالتا ہے لیکن اگر تم سے یہ کہا جائے کہ اس شعر یا خطبہ کی خوبیوں کو بیان کرو تو یہ کام انتہائی مشکل ہوتا ہے۔بلکہ جو شخص آپ کی وضاحت سنے گا ہو سکتا ہے کہ وہ اس شعر یا خطبہ سے ذرا بھی متاثر نہ ہو۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ وضاحت جس قدر زیادہ ہوتی جائے گی تاثیر اتنی ہی کم ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان عقلی و نظری علوم میں انہماک رکھنے والے ان کی تحقیق کے معاملے میں ان لوگوں سے کہیں دور ہوتے ہیں جن کو سلیم فطرت اور مستقیم طبیعت عطا ہوئی ہے۔(ر:۲۲۰-۲۲۲)

اصول تفسیر پر کام کی ضرورت باقی ہے :

یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ دین کا بڑا حصہ نفس کی ترقی، عقلوں کی تربیت اور ظاہری اعمال کی اصلاح یعنی اخلاق، عقائد اور شرائع پر مبنی ہے۔ قرآن نے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں بہترین رہنمائی دی ہے۔ یہ سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ان سب سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے جو دین کا اصل مقصود و مطلوب ہے۔

ان تین بنیادوں سے تین علوم پیدا ہوئے۔ علم اخلاق و مواعظ، علم کلام اور علم فقہ۔ علماء نے ان میں سے اصول فقہ کے ذیل میں قرآن مجید کی تاویل کے اصول کا کچھ حصہ شامل کیا ہے جب کہ اخلاق اور علم کلام قرآن سے بالکل غیر متعلق ہو گئے۔

جہاں تک علم اخلاق کا تعلق ہے یہ بہت پھیل گیا۔اس کے حاملین نے ہر وہ چیز اس میں ٹانک لی جو ان کو پسند اور دل کو بھا گئی۔ بعض لوگ اس کی بنا فلسفیوں سے حاصل کردہ حکمت عملی پر رکھتے ہیں، بعض تجربات پر اعتماد کرتے ہیں، بعض اس کو ضعیف روایات پر تعمیر کرتے ہیں اور کبھی قرآن سے بھی اپنی کمزور تاویلات کے لیے سہارا لیتے ہیں۔اس کی بنیاد ان کے نزدیک یہ ہے کہ ترغیب و ترہیب کے مقصد کے لیے اور کسی اچھائی کی مدح اور برائی کی مذمت کے لیے دلیل کے صحیح ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

صوفیاء کا ایک گروہ بھی علم اخلاق کا حامل ہے۔ انہوں نے عقائد میں کلام کیا لیکن وہ عربی زبان سے ناواقفیت اور دین کی حقیقت سے بے خبری کے باعث قرآن کی تاویل اپنے تصورات کے مطابق کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن اور اس کے اسرار ورموز کا ان سے زیادہ کوئی جاننے والا نہیں۔ اس طرح کے دعوے ابن عربی کے کلام میں ملتے ہیں۔

رہا علم کلام تو اس کے حاملین کی دلچسپی چونکہ ملحدین کے ساتھ رہی اس لیے نقل کے اوپر ان کا اعتماد کم ہو گیا اور ان کی بحث کا بیشتر اسلوب یہ رہا کہ عقل کا جھکاؤ کس طرف ہے جس کو حریف بھی تسلیم کر لے۔ یہ لوگ کبھی کبھی حریف کے اعتراضات سے جان چھڑانے کی غرض سے قرآن کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو قرآن کی مراد ہرگز نہیں ہے۔ یہ لوگ جب صحیح تاویل تک نہ پہنچ سکے اور عقل و نقل میں تطبیق پیدا نہ کر سکے تو انہوں نے تاویل کے لیے دروازے ہی نہیں بلکہ ایسے رخنے چھوڑے جہاں سے وہ اس وقت نکل سکیں جب سیدھے طریقہ سے دفاع ممکن نہ رہے۔ یہاں تک کہ رازی جیسے شخص نے، اللہ ان کو معاف فرمائے، یہ کہہ دیا کہ ظاہر قرآن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، ہو سکتا ہے وہ متشابہات میں سے ہو۔ چنانچہ انہوں نے پورے قرآن کو مشتبہ بنا دیا۔ یہ حادثہ صرف اس لیے پیش آیا ہے کہ قرآن سے استنباط کے لیے عام اصول تاویل وضع نہیں کیے گئے جن پر اعتماد کیا جا سکتا اور جو ہر علم میں کار آمد ہوتے، خواہ اس کا تعلق عقائد سے ہو یا اخلاق سے یا شریعت سے۔

(ر: ۲۱۳-۲۱۴)

تاویل قرآن کے اصول کو اصول فقہ کا ایک حصہ بنا دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کو ایک الگ مستقل فن بنایا جا سکا اور نہ وہ وسعت نظر اس کو میسر آئی جو ایک مستقل فن کے لیے مطلوب ہوتی ہے۔

چونکہ فقہ کا موضوع فروعی مسائل ہوتے ہیں اس لیے تاویل قرآن کے اصول کے معاملے میں وہ بیداری اور احتیاط بھی بروئے کار نہ لائی جا سکی جو اصول دین میں مطلوب ہے۔ خیال یہی رہا کہ فروعی مسائل میں اختلاف کا پیدا ہونا ایک معمول کی بات ہے لہٰذا قرآن کی تاویل کے اختلافات کو بھی زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا گیا۔

پھر علم فقہ سے قرآن اور سنت کے درمیان مشترک ہونے کے باعث بھی یہ علم وہ اہمیت حاصل نہ کر سکا جس کا یہ مستحق تھا۔ سنت میں زیادہ لحاظ راویوں پر تنقید کا ہوتا ہے۔ متن کے اندر الفاظ اور جملوں کی ترکیب پر زیادہ غور نہیں کیا جاتا کیونکہ روایات اکثر بالمعنی نقل ہوئی ہیں۔ قرآن کا معاملہ مختلف ہے۔ اس کے الفاظ پر گرفت مضبوط رکھی جاتی ہے، اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک حرف پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔ اس کے نظم اور اشارات سے جو نتائج نکلتے ہیں، ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ آیات کے مطالب کے کمزور احتمالات کی نفی کی جاتی ہے۔ جس چیز میں شبہ پیش آئے اس کو محکم آیات کی روشنی میں جانچا جاتا ہے۔ کسی کمزوری کو نہ آیات کے مطالب میں اور نہ ان کی تنزیل میں معاف کیا جاتا ہے۔

اگر اصول تاویل کو قرآن کی تفسیر کے علم کا حصہ بنایا جاتا تو دین میں اس کو بے حد اونچا مقام حاصل ہوتا اور اس میں کامل محنت صرف کرنا اور کمزور آراء کے در آنے سے احتیاط کرنا ممکن ہوتا۔ اس کے بعد اس علم کو حدیث اور دوسرے کلام میں بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کو جو اصول فقہ کا حصہ بنا دیا گیا تو یہ علم اپنے مرتبہ سے تین اعتبار سے نیچے گر گیا۔

اولاً یہ علم مستقل بحث کے لائق تھا لیکن جب دوسری چیزیں اس میں شریک ہو گئیں تو یہ ان کے اندر دب کر رہ گیا۔

ثانیاً: یہ علم فہم قرآن کے اصول ہونے کے باعث علم تفسیر کا سب سے بڑا حصہ تھا لیکن جب اس کو فروعی علم میں شمار کر لیا گیا تو اس کی وہ تنقیح نہ ہو سکی جس کے نتیجہ میں یہ تاویل قرآن کے لیے اس طرح کی کسوٹی یا میزان بن سکتا جس طرح کی کسوٹی اور

میزان علم نحو و عروض ہے۔لہذا یہ علم ایک کامل فن کی حیثیت اختیار نہیں کر سکا۔اس میں کمال فن یہی کچھ رہا کہ جس طرح قوموں کے مختلف قوانین ہوتے ہیں اسی طرح اس میں کچھ شخصی اصول قرار پائیں اور کہا جائے کہ ابو حنیفہؒ نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے اور شافعیؒ فلاں اصول کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

ثالثاً: قرآن فروعی احکام تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا بیشتر حصہ عقائد اور اخلاقیات سے متعلق ہے۔جب علم تاویل اصول فقہ کا حصہ بنا دیا گیا تو یہ احکام تک محدود ہو گیا۔اس سے ایک ایسے علم کی بنیاد رکھنے میں جو فہم قرآن کی طرف رہنمائی دیتا ہو، بڑا رخنہ پیدا ہو گیا۔(ر ۲۱۲۰-۲۱۳)

اگر قرآن مجید کو تمام علوم دین کی بنیاد مانا ہو جو کہ یہ فی الحقیقت ہے بھی، تو یہ بات واجب ہو جاتی ہے کہ اس کے اصول تاویل وضع کیے جائیں تاکہ ایک ایسا عمومی علم وجود میں آئے جس سے قرآن سے استفادہ میں کام لیا جا سکے۔میں کثرت تاویل کی لاعلاج بیماری کا علاج اسی میں دیکھتا ہوں کہ قرآن کا دامن تھام لیا جائے اور روایات اور آراء کو اللہ کی کتاب کی طرف لوٹایا جائے۔اس کے لیے یہ ماننا لازم ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا، کہ قرآن ایک ہی صحیح تاویل کا حامل ہے اور اس کی دلالت قطعی ہے اور اس کی عبارت کا مدلول ایک ہی ہوتا ہے۔(ر: ۲۱۴، ۲۳۰)

اصول تفسیر کے وضع کرنے کے فوائد:

اصول تفسیر وضع کرنے کے مقاصد دو ہوں گے۔ایک یہ کہ ان کی مدد سے دل کو اطمینان ہو گا، دوسرا یہ کہ غلط اور متضاد احتمالات کا دروازہ بند ہو جائے گا۔حقیقت میں یہ دو نہیں بلکہ ایک ہی مقصد ہے اور اس کے فوائد بہت زیادہ ہوں گے۔جن میں سے بعض کا ذکر ہم یہاں کرتے ہیں:

۱- کلام میں حذف بھی ہوتا ہے اور اضافہ بھی (مثلاً دفع دخل مقدر کے لیے، تمہید یا

وضاحت کے لیے یا موقع و محل کے مطابق اصول و فروع میں سے کوئی مناسب بات داخل کر دی جاتی ہے) کبھی کسی چیز کو کہیں مقدم کر دیا جاتا ہے کہیں موخر، یا ایک چیز کی جگہ دوسری چیز رکھ دی جاتی ہے- تو مفسر کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ کلام کو اس کے اصل کی طرف لوٹائے اور اصل سے ان چیزوں کو جو ہٹایا گیا ہے اس کی حکمت کو واضح کرے-

۲- ایک کلام کے درمیان اور حالات وواقعات کے درمیان کئی مناسبتیں ہوتی ہیں- ان کی روشنی میں ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز پیش کی جاتی ہے- کلام کی مقدار میں اجمال و تفصیل ملحوظ رکھی جاتی ہے- اسلوب کلام میں نفس کے جذبات میں سے نرمی یا سختی رکھی جاتی ہے جس کا تقاضا متکلم اور مخاطب اور اس مخاطب کے حالات کر رہے ہوتے ہیں- مفسر کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ محکم اصولوں کی روشنی میں ان مناسبتوں کو سمجھے اور اس کے لیے ضعیف روایتوں کا سہارا نہ لے- ان میں سے بقدر ضرورت انہی روایات کا تذکرہ کرے جو ثابت ہوں-

۳- کلام میں کچھ اصول ہوتے ہیں جن کو وہ ثابت کرتا ہے اور کچھ فروع ہوتے ہیں جن کی طرف وہ اشارہ کرتا ہے- یہ مفسر کا کام ہے کہ غور کر کے وہ اصول کو واضح کرے اور فروع کا استنباط کرے- یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے- مفسر کو چاہیے کہ وہ فرصت اور موقع کے مطابق ان کو بیان کرے اور حتی الامکان تکرار سے اجتناب کرے-

۴- مفسرین کے ہاں ایسے کمزور اقوال ملتے ہیں کلام جن کا متحمل نہیں ہوتا- اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ ان اقوال کے ضعف کے اسباب کو واضح کیا جائے لیکن یہ کام نہایت تھکا دینے والا اور وقت ضائع کرنے والا ہے کیونکہ جہالت اور جھوٹ کے اتنے دروازے ہیں جن کا شمار بھی ممکن نہیں-

اسی طرح کبھی کبھی واضح طور پر صحیح تاویل مخفی اور لوگوں سے دور بھی ہوتی ہے- اس کا

سبب یا تو لوگوں کی کوئی غلطی ہوتی ہے یا اس بنیاد سے لاعلمی جس پر تاویل قائم ہوتی ہے۔ یہ بہت زیادہ نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن فی الحقیقت ایسا بکثرت ہوا ہے جس کے اسباب ہم یہاں بیان نہیں کریں گے۔ ایک مفسر مجبور ہوتا ہے کہ ایسی غلطیوں کو خواہی نخواہی دور کرے۔ وہ لوگوں کی حماقتوں کے بیان سے گھبراتا ہے لیکن اگر وہ یہ ذمہ داری ادا نہیں کرتا تو باطل کے جراثیم ختم نہیں ہوں گے۔ سیدھی راہ کی توفیق دینے والا اللہ ہے۔

۵- قرآن مجید کی تاویل کے اصول قائم کرنے اور ان کو مضبوط بنیادوں پر اٹھانے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ مسلمانوں کا ہر فرقہ سہارا قرآن ہی کا لیتا ہے لیکن اس کی تاویل اپنی رائے سے کرتا ہے۔ یہیں سے اہل ایمان سنت کا سہارا لینے پر مجبور ہوئے۔ ان کا گمان یہ ہو گیا کہ قرآن تو پہلو دار ہے لیکن سنت واضح ہے۔ بدیہی بات یہ تھی کہ قرآن مضبوط پکڑنے اور قابل اعتماد سہارا بننے کے لائق تھا۔ یہ تو باطل پسندوں کی حرکت تھی کہ انہوں نے اس کے مفاہیم کو اصل سے پھیر دیا۔

اس صورت حال میں اگر میں صحیح اصول تاویل واضح کروں تو لوگوں کے لیے مفہوم کو اصل سے پھیرنا ممکن نہ ہو گا۔ قرآن سے مایوسی باقی نہیں رہے گی۔ احادیث کا سہارا لے کر جھوٹی تاویلات کا دروازہ بند ہو گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن اور اس کے نظم کو تو مضبوطی سے پکڑا جائے اور جو تاویل بنتی ہو اس کو سنت، صحیح روایات اور عقل صریح کی روشنی میں مدلل کیا جائے۔ (ر: ۲۲۴-۲۲۵)

اصول تفسیر سے متعلق چند تمہیدی مباحث

معروف و منکر:

معروف وہ ہے جس کو عرب نے معروف مانا ہو اور منکر وہ ہے جس کو انہوں نے منکر مانا ہو۔ اہل عرب زمانہ جاہلیت میں ایسے جنگلی نہیں تھے کہ خیر و شر میں ان کو کوئی امتیاز ہی نہ ہو۔ یونانیوں اور ہندوستانیوں کے روشن ترین دور میں ان قوموں کے ادب کا جو حال تھا، اہل عرب کا ادب اخلاقی اعتبار سے ان سے بھی بدرجہا اونچا تھا۔ جن لوگوں نے ان کی تاریخ بگاڑی ہے اگر ان کی مہملات سے قطع نظر کر کے تم ان کے کلام پر نظر ڈالو تو معلوم ہو گا کہ ان کا اخلاقی معیار کتنا بلند تھا۔ ان کے ہاں اخلاق کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امرء القیس باوجودیکہ ایک بادشاہ تھا لیکن چونکہ اس کی شاعری میں رندی اور ہوسناکی کا پہلو نمایاں تھا اس وجہ سے وہ الملک الضلیل (آوارہ مزاج بادشاہ) کے لقب سے مشہور ہو گیا۔ ان کے ہاں وہی چیزیں معروف میں داخل تھیں جو مکارم اخلاق میں شمار ہوتی ہیں اور قرآن نے ان کے سامنے جو چیزیں پیش کیں وہ ان کے معروف کی تکمیل کرنے والی تھیں، نہ کہ ان کو ہدم کرنے والی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اندر جو صالح طبیعتیں تھیں ان کو قرآن نے بہت جلد اپنی طرف جذب کر لیا۔ صرف ان لوگوں نے اس کی مخالفت کی جو شریر تھے یا جن کو اپنی مذہبی یا سیاسی پیشوائی کے چھن جانے کا اندیشہ تھا، ٹھیک اسی طرح جس طرح علمائے یہود نے ضد اور حسد کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی۔ امیہ بن ابی الصلت وغیرہ کے متعلق کون نہیں جانتا کہ یہ دین حنیفی کے معتقد تھے، لیکن محض بربنائے حسد ان لوگوں نے نبی ﷺ کی مخالفت کی۔

پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ نبی کی روح بیدار خود بھی معروف و منکر کی شناخت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ جن چیزوں کے بارہ میں وحی کی رہنمائی موجود نہیں ہوتی ان میں وہ اپنے

الہام سے امت کو کوئی حکم اس وقت تک کے لیے دیتا ہے جب تک وحی نہ آجائے- اور یہ کام اس کے منصب کا ایک قدرتی جزو ہوتا ہے- نیز اس کو خدا کی طرف سے امر بالمعروف کا حکم ہوتا ہے اور امت کو یہ ہدایت ہے کہ وہ معروف میں سے جن باتوں کا حکم دے ان میں اس کی پیروی کرے- ان کے علاوہ آپ کے زمانہ میں پچھلی آسمانی شریعتوں کی بہت سی بچی کھچی باتیں باقی رہ گئی تھیں- مثلاً دین حنیفی کی تعلیمات میں سے حج، قربانی اور نماز کے کچھ بقایا موجود تھے- نیز اہل کتاب کے طریقے موجود تھے[1] آپ نے وقتی طور پر ان میں سے بعض باتیں اختیار کیں اور وحی الٰہی کے آجانے کے بعد چھوڑ دیں-

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ نبی ﷺ کو شروع شروع میں جزئیات احکام کا حکم نہیں ہوا بلکہ صرف معروف کا حکم ہوا- مثلاً نماز، ذکر الٰہی، صدقہ، یتیم پر شفقت اور اس قسم کے دوسرے مکارم اخلاق- پھر جب کسی چیز کے بارہ میں تفصیل نازل ہو گئی تو اس میں اللہ کی تعلیم اصل بن گئی اور معروف کا لحاظ ختم ہو گیا-

بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی امر کے بارہ میں معروف کا حکم ہوا- پھر اس کے متعلق توضیح نازل ہوئی تو جس حصہ سے متعلق توضیح نازل ہوئی اس میں تو معروف منسوخ ہو گیا اور جس بارہ میں توضیح نازل نہیں ہوئی اس میں معروف کا حکم بدستور باقی رہا- مثلاً مرنے والے کی وصیت والدین کے لیے منسوخ ہو گئی اور جن اقربا کو وراثت میں کوئی حق نہیں ملا ہے ان کے لیے باقی رہ گئی-

اصل یہ ہے کہ جن جزئیات تک انسان کی عام عقل اور فطری صلاحیت خود بخود پہنچ سکتی تھی، ان کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر نہیں لادا- اگر وہ ایسا کرتا تو تقویٰ اور نیکی کی جو صلاحیت خود ہمارے اندر موجود ہے وہ مردہ ہو جاتی- چنانچہ اس طرح کے معاملات میں اس نے ہماری عقل پر معروف کو چھوڑ دیا، جیسا کہ بہت سی آیتوں میں دیکھتے ہو[1]...... اور یہ معروف کو باقی رکھ کر اور لوگوں کو اس کے اختیار کرنے کی دعوت دے کر پیغمبر ﷺ نے

ملک کے قانون اور اس کے اچھے رسوم کی عزت بڑھائی ہے اور یہ اس امر کی صاف شہادت ہے کہ اسلام نے انقلاب اور تخریب کی بجائے اصلاح اور تکمیل کی راہ اختیار کی ہے-اس نے سابقہ ادیان کی بالاجمال تصدیق کی اور ان میں جو زیادتیاں شامل ہو گئی تھیں ان کو خارج کر کے لوگوں کو ان کی قدیم شاہراہ اور اس فطری ہدایت پر پہنچادیا جو آدم کے وقت سے موجود تھی-
(م:۵۶-۵۸)

قرآن اور سابقہ الہامی کتب میں تعلق :

جس طرح سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد تاروں کی روشنی کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی-اسی طرح قرآن کے نازل ہو جانے کے بعد مسلمان ان پچھلی آسمانی کتابوں سے بالکل بے نیاز ہو گئے جن میں جھوٹی اور سچی ہر قسم کی باتیں ملادی گئی تھیں- قرآن مجید اگلے صحیفوں کے بعد دو خاص مقصدوں کے لیے نازل ہوا ہے :-

۱- دین کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا اس کی تکمیل کے لیے-

۲- جن چیزوں میں اہل کتاب مختلف ہو گئے تھے یا جن میں بھٹک گئے تھے، یا جن کو انہوں نے بھلا دیا تھا، یا جن میں انہوں نے زیادتی یا تبدیلی کر دی تھی ان کی وضاحت کے لیے- چنانچہ قرآن مجید میں ان کی اس زیادتی اور تبدیلی کی طرف اشارہ ہے-فرمایا :-

فویل للذین یکتبون الکتب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عنداللہ لیشتروا بہ ثمناً قلیلا- (بقرہ:۷۹)

(پس ان لوگوں کے لیے ہلاکی ہے جو کتاب اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے کچھ معاوضہ حاصل کرلیں)

یہ وہ اصلی مقاصد ہیں جن کے لیے قرآن مجید نازل ہوا ہے-باقی اس پر مزید ذکر الٰہی اور دعوت و موعظت کی وہ باتیں ہیں جو تمام آسمانی کتابوں کی خصوصیات میں سے ہیں-

قرآن مجید نے اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے حکمت کی صرف اعلیٰ باتوں اور بلند حقائق ہی کو پیش نظر رکھا اور قصوں، تاریخی جزئیات اور جزوی احکام کی ان تفصیلات سے زیادہ تعرض نہیں کیا جن سے بالعموم قرآن کے مخاطب واقف تھے- کیونکہ واقفیت کے موجود ہوتے ہوئے ان کو دہرانا طبیعتوں پر بار اور بالکل بے نتیجہ ہوتا- چنانچہ قرآن نے جو قصے بیان کیے ہیں نہایت بلاغت کے ساتھ یا تو بطور تلمیح اور مثال بیان کیے ہیں یا اہل کتاب کے کسی بڑے فریب کو واضح کرنے کے لیے بیان کیے ہیں-- اسی طرح احکام و قوانین کے معاملہ میں صرف اس حصہ سے تعرض کیا ہے جو تہذیب و تکمیل کا محتاج تھا-

آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والے یا تو اہل کتاب میں سے تھے یا ان لوگوں میں سے جو اہل کتاب سے میل جول رکھ چکے تھے، اس وجہ سے پچھلی کتابوں کی باتوں سے واقف تھے اور قرآن مجید کے ایجاز کے سبب سے ان کو اصل مسائل کے سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں پیش آتی تھی- بلکہ سابق صحیفوں اور قرآن مجید میں اصولی تعلیمات کے اتفاق کے باوجود جو فرق عظیم وہ پاتے اس سے ان کی نظروں میں قرآن کی عظمت بہت بڑھ جاتی- ان لوگوں کے اس تاثر کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے :-

و اذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینهم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا امنا فاکتبنا مع الشهدین-(مائدہ : ۸۳)

(جب وہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسول پر اتری ہے تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں بسبب اس حق کے جس کو انہوں نے پہچان لیا- کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے پس ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ)

اس تفصیل سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں :-

۱- پرانے صحیفوں کی غلطیوں کی تصحیح اور ان کی مشکل آیتوں کی تاویل قرآن کی روشنی میں

کرنی چاہیے۔اہل کتاب کے لیے حق معلوم کرنے کی راہ یہی ہے۔

۲۔ قرآن اور کتب سابقہ کے مشترک قصوں میں جہاں اختلاف ہوگا وہاں ہم قرآن کی طرف رجوع کریں گے۔

۳۔ ابتداء سے لے کر تکمیل شریعت تک کے تمام مدارج کا جو شخص مطالعہ کرے گا اس پر اس ملت کاملہ کی فضیلت واضح ہوگی۔

۴۔ متضاد اور مخلوط اسرائیلیات کی حقیقت واضح ہوگی اور ہم میں سے جو لوگ ان کے سبب سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں ان کی غلطیوں کی اصلاح ہو جائے گی۔

۵۔ اہل کتاب پر یہ ت واضح ہوگی کہ قرآن ان کی کتابوں سے اخذ نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے برعکس ان کی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے اور ان کو اوہام و خیالات کی وادی سے نکال کر حقیقت کی شاہراہ پر لاتا ہے۔

۶۔ قرآن کی ان بہت سی آیتوں کی تاویل ہو سکے گی جو درحقیقت توریت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔لیکن ہمارے مفسرین ان کو قرآن سے متعلق خیال کرتے ہیں۔مثلاً آیت ما ننسخ من آية او ننسها الايه (بقرہ:۱۰۶) یا آیت فينسخ الله ما يلقى الشيطن الايه۔(الحج:۵۲)

تفسیر کے خبری مآخذ:

بعض ماخذ اصل و اساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض فرع کی۔اصل و اساس کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے۔اس کے سوا کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔باقی فرع کی حیثیت سے تین ہیں۔

۱۔ احادیث۔

۲۔ قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات۔

۳۔ گزشتہ انبیاء کے صحیفے جو محفوظ ہیں۔

اگر احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن اور شبہ کو دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فرع کے درجہ میں نہ رکھتے بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے۔ پس جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ روایات کے ذخیرہ میں سے ان روایات کو نہ لے جو اصل کو ڈھانے والی ہوں۔ بعض روایتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کی تاویل نہ کی جائے تو ان کی زد براہ راست اصل پر پڑتی ہے اور ان سے سلسلہ نظم درہم برہم ہوتا ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ بہت سے لوگ آیت کی تاویل تو کر ڈالتے ہیں لیکن روایت کی تاویل کی جرأت نہیں کرتے۔ بسا اوقات تو صرف آیت کی تاویل ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ اس کے نظام کی بھی قطع و برید کر ڈالتے ہیں۔ حالانکہ جب اصل و فرع میں تعارض ہو تو کاٹنے کی چیز فرع ہے نہ کہ اصل۔

وکاین راینا من فروع طویلة تموت اذا لم تحیهن اصول

(اور کتنی دراز شاخیں ہم نے دیکھی ہیں کہ جب جڑیں ان کو غذا نہیں پہنچاتیں تو وہ سوکھ کر رہ جاتی ہیں)

اور سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو ایسی روایتیں تک قبول کر لیتے ہیں جو نصوص قرآن کی تکذیب کرتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جھوٹ بولنے کی روایت[۲]، یا آنحضرت ﷺ کے خلاف وحی قرآن پڑھ دینے کی روایت[۳]۔ اس طرح کی روایات کے بارہ میں ہم کو نہایت محتاط رہنا چاہیے۔ صرف وہ روایتیں قبول کرنی چاہئیں جو قرآن کی تصدیق و تائید کریں۔ (م: ۴۷)

اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خبر، اگرچہ متواتر ہو، قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ اس کی یا تو تاویل کریں گے یا اس میں توقف کریں گے لیکن اس کی خاطر قرآن کو منسوخ نہیں کریں گے۔ امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور عام اہل حدیث، حدیث کو قرآن کے لیے ناسخ نہیں مانتے اگرچہ حدیث متواتر ہو۔ پس جب یہ ائمہ حدیث جو حدیث کے

معاملہ میں صاحب البیت کی حیثیت رکھتے ہیں، اس بات کے قائل نہیں ہوئے تو اس بارہ میں ہم فقہاء و متکلمین کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس فتنہ سے امان میں رکھے کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ رسول، اللہ کے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اس طرح کے مواقع میں تمام تر راویوں کے وہم اور ان کی غلطی کو دخل ہے اور فریقین کے دلائل پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ حق کیا ہے۔ (م: ۳۹)

اسی طرح اہل کتاب کی جو روایات ہمارے ہاں پھیلی ہوئی ہیں ان کے مقابل میں خود اہل کتاب کی تاریخ قابل ترجیح ہے کیونکہ مفسرین نے بالعموم یہ روایتیں ایسے لوگوں سے نقل کی ہیں جو بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کی تاریخ سے بہت کم واقف تھے۔ پس بہتر یہ ہے کہ ان کے بے اصل افسانوں کے بجائے ان کی معتبر کتابوں کو ہم ماخذ بنائیں اور ان کو تائید کے طور پر پیش کریں، اور جہاں کہیں وہ قرآن سے مختلف ہوں وہاں ان کو چھوڑ دیں کیونکہ یہ قطعی معلوم ہے کہ ان کتابوں میں حق کو چھپایا گیا ہے۔ نیز ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ، انتم اعلم ام الله (بقرہ: ۱۴۰) (تم زیادہ جانتے ہو کہ اللہ) اس طرح کے کتمان و تحریف کی نہایت واضح مثال حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے معاملہ میں موجود ہے۔ پس لازماً جو کچھ قرآن میں ہے ہم اسی کو اصل قرار دیں گے۔ اس اصول میں کسی کے لیے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم مسلمان آسمانی کتابوں میں کسی قسم کی تفریق کو جائز نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک قرآن انہی میں سے ایک ہے لیکن جب روایت میں اختلاف ہو گا تو ہم کو صحت روایت کے لیے اہتمام کرنا پڑے گا۔ اور اس وقت ہم مجبوراً اس روایت کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ صحیح اور معتبر ثابت ہو۔ ہاں اگر باہم دگر کوئی اختلاف نہ ہو تو ہم روایت کی کسوٹی پر جانچ کر دوسری آسمانی کتابوں سے بھی لے سکتے ہیں۔ اگرچہ از روئے روایت ان کا کوئی وزن نہیں ہے۔ مثلاً ہم زبور میں سے اس چیز کو لیں گے جس کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے۔

ولقد كتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثها عبادی الصالحون-(انبیاء :۱۰۵)

(ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے نیکوکار بندے ہوں گے)

اور موسیٰ کے صحیفوں میں سے اس چیز کو اخذ کریں گے جس کی طرف آیت ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے :-

ان هذا لفی الصحف الاولی صحف ابراهیم و موسی (اعلیٰ :۱۸-۱۹)

(یہ اگلے صحیفوں میں ہے، ابراہیم و موسیٰ کے صحیفوں میں)

اسی طرح مندرجہ ذیل قسم کی آیات کی توضیح کے لیے ہمیں بنی اسرائیل کی تاریخ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا-

و قضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب لتفسدن فی الارض مرتین(اسرا :۴)

(اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کو اپنے فیصلہ کی اطلاع دے دی تھی کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد کرو گے)

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن مجید اپنی تفسیر کے لیے ان فروع کا محتاج نہیں ہے-وہ تمام کتابوں کے لیے خود مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں کہیں اختلاف واقع ہو تو اس کی روشنی جھگڑے کو چکانے والی بنے گی- لیکن اگر تم کو قرآن مجید کی تصدیق و تائید کی ضرورت ہو تو ان فروع کی مراجعت سے تمہارے ایمان اور اطمینان میں اضافہ ہو گا- یہی حکمت ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ حکم دیا ہے-

قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة المکذبین

(کہہ دو ملک میں سیاحت کرو اور دیکھو منکروں کا انجام کیسا ہوا)

بہر حال جو لوگ اگلے صحیفوں کی مراجعت کریں گے ان کو گوناگوں فوائد حاصل ہوں گے۔ مثلاً:۔

☆ ان صحیفوں کے مقابل میں قرآنی تعلیم کی فضیلت واضح ہو گی۔

☆ ان کی نصیحت سے تنبہ ہوتا ہے اور آدمی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

☆ تنقید اور حق و باطل میں امتیاز کی صلاحیت بڑھتی ہے۔

☆ قرآن کے بعض اشارات کی تفصیل مل جانے سے انکی حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔

☆ قرآن کے بیان کردہ امور کا رخ صحیح تاویل کی طرف موڑنے میں سہولت ہوتی ہے۔

☆ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے ناسخ کو سابقہ کتب کے منسوخ پر کن اعتبارات سے فضیلت حاصل ہے۔

☆ رفقائے صالحین سے انس پیدا ہوتا ہے۔

☆ اپنی کتابوں میں سے جو کچھ اہل کتاب نے بھلا دیا ہے، قرآن کی رہنمائی سے ان کا اعادہ ہوتا ہے۔

☆ جو کچھ اہل کتاب نے بدل ڈالا ہے اس کا انکشاف ہوتا ہے۔

ایک اور قابل لحاظ حقیقت یہ ہے کہ قرآن سے جو کچھ ثابت ہو اس میں اور فروع سے جو کچھ معلوم ہو اس میں فرق کرنا چاہیے۔ دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ قطعی ثابت ہے اور فروع میں وہم و ظن کے لیے بہت کچھ گنجائش ہے۔ پس اگر کوئی شخص فروع میں سے کسی بات کا منکر ہو تو وہ قرآن کے منکروں کی طرح نہیں ہو سکتا۔ (م: ۳۸-۳۹)

تفسیر کے لسانی مآخذ:

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ وہ متن قرآن کی حفاظت کرے گا

انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون (حجر :۹)(ہم نے ذکر کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) اسی طرح اس کی تشریح وبیان کا بھی وعدہ فرمایا ہے۔

ثم ان علینا بیانہ (القیامہ :۱۹)(پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔)

چنانچہ یہ اسی وعدہ کا ایفا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربی زبان کو ایک زندہ و قائم زبان بنا دیا ہے اور اس کو مٹنے سے محفوظ رکھا ہے۔ اسی طرح تمام اصطلاحات شرعیہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، جہاد، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسک حج وغیرہ اور ان کے ساتھ جو اعمال متعلق ہیں، تواتر و توارث کے ساتھ سلف سے لے کر خلف تک، سب محفوظ رہے۔ ان میں جو معمولی جزوی اختلافات نظر آتے ہیں وہ بالکل ناقابل لحاظ ہیں۔ شیر کے معنی ہر شخص کو معلوم ہیں، اگرچہ مختلف ممالک کے شیروں کی شکلوں اور صورتوں میں کچھ نہ کچھ اختلافات ہیں۔ اسی طرح جو نماز دین میں مطلوب ہے وہ وہی نماز ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں، ہر چند کہ اس کی ہیئت میں بعض جزئی اختلافات ہیں۔ جو لوگ اس طرح کی چیزوں میں زیادہ کرید اور موشگافی سے کام لیتے ہیں، وہ اس دین فطرت کے مزاج سے بالکل ناواقف ہیں جس کی تعلیم قرآن پاک نے دی ہے۔ یہ قرآن پاک ہی کی تعلیم ہے کہ

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقوی منکم(الحج :۳۷)

(خدا تک تمہاری قربانیوں کے گوشت اور خون نہیں پہنچ سکتے بلکہ تمہارا تقویٰ ہی اس تک پہنچ سکتا ہے)

پس جو لوگ اس طرح کے امور میں زیادہ کرید کرتے ہیں وہ ان یہودیوں کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں جنھوں نے اپنے دین میں اختلاف ڈالا اور شبہات میں پڑے۔ ان لوگوں کی حالت کی تصویر قرآن نے اس جگہ کھینچی ہے جہاں سورہ بقرہ میں ان کے گائے ذبح کرنے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ پیغمبر بار بار کہہ رہا ہے کہ فافعلوا ما تومرون (جو حکم دیا جا رہا ہے اس

کی تعمیل کرو) لیکن وہ مد لہ سوال پر سوال کیے جارہے ہیں، اور ردو کد کے بعد بھی شاید ان کو ذبح کی توفیق نہ ہوتی لیکن ان شاء اللہ کی برکت نے ان کو ایک عظیم فتنہ سے بچالیا- چنانچہ قرآن نے ان کے حق میں یہ الفاظ فرمائے-وما کادوا یفعلون (اور قریب تھا کہ وہ نہ کرتے)

پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ کا معاملہ پیش آئے جن کی پوری تعریف اور تصویر قرآن میں بیان نہ ہوئی ہو تو ان کے بارہ میں خواہ مخواہ کو اخبار احاد پر نہیں جم جانا چاہیے، ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود بھی شک میں پڑو گے اور دوسروں کے اعمال کو بھی غلط ٹھہراؤ گے اور ان سے جھگڑو گے اور تمہارے درمیان کوئی چیز ایسی نہیں ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے- ایسی صورتوں میں صحیح راہ عمل یہ ہے کہ جتنے حصہ پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور جن چیزوں کے بارہ میں کوئی نص صریح اور متفق علیہ عمل نبی ﷺ کا موجود نہیں ہے ان میں اپنے دوسرے بھائیوں سے جھگڑا نہ کرو- جہاں تک اصطلاحات شرعیہ کا تعلق ہے، قرآن کی اسی وسیع شاہراہ پر چلنا چاہیے-

باقی رہے دوسرے الفاظ اور حقیقت و مجاز کے مختلف اسلوب تو اس باب میں ماخذ قدیم کلام عرب اور خود قرآن مجید ہے- لغت کی کتابیں ان چیزوں کی تحقیق میں کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کرتیں- ان سے بالعموم نہ تو الفاظ کی پوری حقیقت معلوم ہوتی، نہ عربی خالص اور عربی مولد کے درمیان کوئی امتیاز ہوتا ہے اور نہ لفظ کی جڑ ہی کا پتہ لگتا کہ معلوم ہو سکے کہ کیا اصل ہے کیا فرع اور کیا حقیقت ہے کیا مجاز؟ تو جو لوگ کلام عرب میں مہارت نہیں بہم پہنچاتے بلکہ صرف لغت کی کتابوں پر قانع ہو جاتے ہیں وہ بسا اوقات قرآن مجید کے معانی سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں- پھر قدیم کلام عرب کا جتنا حصہ ہم تک پہنچا ہے اس میں بہت کچھ ملاوٹ بھی ہے اور غریب و نامانوس الفاظ کی بھی اس میں آمیزش ہے- لیکن ایک ناقد ماہر کے لیے اصل و نقل میں امتیاز کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے- پس ضروری ہے کہ صرف وہ معنی لیے جائیں جو اصلی کلام عرب سے ماخوذ ہوں- شاذ معنی ہرگز نہ لیے جائیں- مثلاً بعض لوگوں نے

آیت وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیته (حج: ۵۲) میں تمنی کے معنی تلاوت کرنے کے لیے۔ اس طرح کے غیر ثابت اور شاذ معنی کی طرف جو لوگ گئے ہیں محض بعض اشکالات سے بچنے کے لیے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ بجائے خود ایک بہت بڑا فتنہ ہے اور اس سے امت میں اختلاف کا دروازہ کھلتا ہے۔ جو شخص اصلی شاہراہ کو چھوڑ کر چلے گا اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھائے۔

اس کے علاوہ جو دوسرے علوم زبان ہیں مثلاً نحو، منطق، اصول، بیان، بلاغت، قافیہ، تو ان پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، اپنے فوائد کی کثرت کے باوجود فہم قرآن کے نقطہ نظر سے لغت کی کتابوں سے بھی زیادہ کوتاہ ہیں۔ موجودہ فن نحو بہت اضافہ کا محتاج ہے۔ یہ صرف متوسط درجہ کے کلام کے لیے اصول فراہم کرتا ہے۔ اس وجہ سے مفسر کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ کلام الٰہی کو موجودہ اصول نحو پر بہت زیادہ منطبق کرنے کی کوشش کرے۔ اس طرح کی کوشش کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کو کلام الٰہی میں ایسی ترمیم و تاویل کرنی پڑے گی جس سے ایک دیکھنے والے کو یہ گمان ہو گا کہ قرآن مجید زبان کی عام شاہراہ سے بالکل ہٹا ہوا ہے۔ بلکہ اس کو کلام عرب سے وہ شہادتیں فراہم کرنی چاہئیں جن سے یہ ثابت ہو کہ قرآن ہی کا اسلوب زبان کا اصلی اور اعلیٰ اسلوب ہے۔

منطق میں تمام تر مدار تحدید و نفی اور استثناء وغیرہ کے الفاظ کے استعمال میں موشگافی پر ہے۔ اس لیے علم آدم الاسماء کلها (بقرہ: ۳۱) (اللہ نے آدم کو سارے نام سکھا دیے) اور وما منعنا ان نرسل بالایات الا ان کذب بها الاولون (اسرا: ۵۹) (اور ہم کو نشانیوں کے بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلا دیا) وغیرہ اسالیب میں جو دلیلیں پنہاں ہیں وہ اس کی گرفت سے باہر ہیں۔

علم البیان کا حال بالکل نحو کا سا ہے۔ جو کلام ایک زندہ قلب کے اندر سے ابلتا ہے یہ علم

اس کی خوبیوں کو بھی واضح کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو آسمان وحی سے برسنے والا کلام اس کی تنگ نائے میں کیا سما سکے گا؟ صاحب وحی بلکہ ہر داعی حق کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب حالات تقاضا کرتے ہیں اس کے قلب کے اندر سے ایک چشمہ ابلتا ہے۔ وہ کبھی مجاز کے رنگ میں گفتگو کرتا ہے، کبھی حقیقت کے بھیس میں، لیکن ہر صورت میں وہ اپنی مخاطب جماعت کے فہم اور اپنی زبان کے طریقوں کی رعایت کرتا ہے۔ وہ باپ اور بیٹے کے الفاظ استعمال کرتا ہے، اپنے جسم کو مختلف جسموں میں بانٹتا ہے۔ اپنا گوشت و خون دوسروں کو کھلاتا ہے۔ ید، ساق، وجہ، عرش، کرسی وغیرہ کلمات اپنی گفتگو میں لاتا ہے۔ بسط و قبض، طی و نشر، حسرت و انتقام اور غضب و محبت وغیرہ الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس کے مخاطب ان کو بے تکلف سمجھتے ہیں۔ البتہ جو شخص علم بیان کی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ لے گا وہ چیونٹی کی طرح چلے گا اور اندھوں کے مانند ٹھوکریں کھائے گا۔ زبور اور صحف انبیاء کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ آسمانی کلام میں مجاز کو کس قدر دخل ہوا کرتا ہے۔

فن اصول فقہ کے متعلق ہم ان لوگوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں جنہوں نے اس کی بنا ڈالی۔ بلاشبہ یہ فن ایک ایسا فن ہے جس کو انہوں نے یونانیوں، ہندوستانیوں یا کسی اور قوم سے نہیں لیا ہے بلکہ ضرورت داعی ہوئی کہ یہ ایسے اصول بنائیں جو کتاب و سنت سے احکام کے استنباط کے لیے ضابطہ کا کام دیں۔ پس اس فن کے بلاشبہ یہ لوگ بانی اور اس میں دوسروں کے یہ امام ہیں۔ لیکن اس بات کا نہایت افسوس ہے کہ بعد والوں کو اس کی تدوین و ترتیب کی توفیق نہیں ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا پورا نظام کمزور اور پھس پھسا رہ گیا۔ اور وہ ربط و نظم اس میں نہیں پیدا ہو سکا کہ اس کو فن کا نام دیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اختلافات بہت ہیں جو بالآخر احکام و قوانین کے اختلاف کا سبب ہوئے۔ نحو اور منطق وغیرہ کا یہ حال نہیں ہے۔

فن بلاغت کو لوگوں نے صرف اشعار سے مستنبط کیا ہے اور اشعار کا دائرہ معلوم ہے کہ

وہ صرف دروبست کی خوبیوں، الفاظ کی نزاکتوں اور بدیع کی صنعت کاریوں تک محدود ہے۔ باقی رہے حسن استدلال کے گوناگوں پہلو، ربط معانی کے مختلف انداز، ضرب امثال کے مختلف طریقے، قصص سے عبرت پذیری کے مختلف ڈھنگ، کلام کا بڑھ کر اپنے مرکز کی طرف لوٹنا، زجر اور عتاب، متکلم کی شدت یقین کا اظہار، متر فعانہ اعراض، ناصحانہ اظہار حسرت وغیرہ جن کی مثالیں صرف خطباء کے کلام اور انبیاء علیہم السلام کی وحی میں مل سکتی ہیں، ہمارے فن بلاغت نے ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ خطبائے عرب کا کلام ان لوگوں کو زیادہ ملا نہیں اور خطبائے عجم کے کلام پر انہوں نے غور نہیں کیا۔ چنانچہ باقلانی نے باوجودیکہ بلاغت قرآن کو بے نقاب کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر ڈالا ہے لیکن استناد کے لیے تمام تر صرف اشعار پر اعتماد کیا ہے۔ خطبات کے صرف تھوڑے سے نمونے دے دیے ہیں تاکہ مقابلہ کر کے تم خود کچھ فرق معلوم کر لو۔ باقی رہے وہ دس امور، جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، جن میں سے پانچ عقلی ہیں اور پانچ نفسی، تو ان کا کوئی ذکر باقلانی نے نہیں کیا ہے۔ یہ امور ایسے نہیں ہیں جو کسی ایک ہی زبان کے ساتھ مخصوص ہوں بلکہ تمام زبانوں میں عام ہیں، اس لیے کلام سے ان پر شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ قرآن مجید خود ان کے اوپر دلیل ہے۔

پھر موجودہ علم بلاغت اسالیب کلام کی معرفت کے لیے بھی کوئی قیمتی رہنمائی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اس فن کے مصنفین عموماً عجمی ہیں اور اہل عجم کے لیے عرب کے انداز و اسالیب پر غور کرنا اور ان کو سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ پس بجائے اس کے کہ ان کو تاہیوں اور نارسائیوں کی شکایت کی جائے، جو تھوڑی بہت خدمت انہوں نے اس فن کی کی ہے اس پر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یہ کیا کم ہے کہ بعض جگہ ان کا تیر نشانہ پر لگا ہے اور بعض جگہ اگر نشانہ پر نہیں لگا ہے تو اس کے قریب قریب پہنچا ہے۔ (م: ۳۹-۴۲)

شان نزول :

شان نزول کا مطلب، جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ کسی آیت یا سورہ کے نزول کا سبب ہوتا ہے، بلکہ اس سے مراد لوگوں کی وہ حالت و کیفیت ہوتی ہے جس پر وہ کلام بر سر موقع حاوی ہوتا ہے۔ کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاص امر یا چند خاص امور کو مد نظر رکھے بغیر کلام کیا گیا ہو، اور وہ امر یا امور جن کو کسی سورہ میں مد نظر رکھا جاتا ہے، اس سورہ کے مرکزی مضمون کے تحت ہوتے ہیں۔ لہذا اگر تم کو شان نزول معلوم کرنی ہو تو اس کو خود سورہ سے معلوم کرو کیونکہ کلام کا اپنے موقع و محل کے مناسب ہونا ضروری ہے۔ جس طرح ایک ماہر طبیب دوا کے نسخہ سے اس شخص کی بیماری معلوم کر سکتا ہے جس کے لیے نسخہ لکھا گیا ہے اسی طرح تم ہر سورہ سے اس سورہ کے شان نزول معلوم کر سکتے ہو۔ اگر کلام میں کوئی خاص موضوع پیش نظر ہے تو اس کلام اور اس موضوع میں وہی مناسبت ہوگی جو مناسبت لباس اور جسم میں بلکہ جلد اور بدن میں ہوتی ہے۔ اور یہ قطعی ہے کہ کلام کے تمام اجزاء باہم دگر مربوط و متصل ہوں گے۔ اور یہ جو روایتوں میں آتا ہے کہ فلاں فلاں آیتیں فلاں فلاں معاملات کے بارہ میں نازل ہوئیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ سورہ کے نزول کے وقت یہ یہ احوال و مسائل در پیش تھے تاکہ معلوم ہو سکے کہ سورہ کے نزول کے لیے کیا محرکات اور اسباب موجود تھے۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں :-

"زرکشی نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں بارہ میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہ وہبات اس آیت کے نزول کا سبب ہے۔ یہ گویا اس حکم پر اس آیت سے ایک قسم کا استدلال ہوتا ہے۔ اس سے مقصود نقل واقعہ نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ اسباب نزول میں ایک قابل لحاظ چیز یہ بھی ہے کہ ضروری نہیں کہ آیت اسی

زمانہ میں نازل ہوئی ہو جس زمانہ میں واقعہ پیش آیا"۔

زرکشیؒ کے اس بیان سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جس کا ذکر امام رازیؒ نے سورہ انعام میں و اذا جاء ك الذين يؤمنون باياتنا الايه کی تفسیر کے ذیل میں کیا ہے۔ وہاں امام رازیؒ فرماتے ہیں :۔

"مجھے یہاں ایک سخت اشکال پیش آیا ہے، وہ یہ کہ لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ یک دفعہ نازل ہوئی تھی۔ اگر صورت معاملہ یہ ہے تو پھر ہر آیت کے بارہ میں یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب نزول فلاں واقعہ ہے"۔

پس ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر کے مباحث سے واضح ہوا، صورت معاملہ یہ ہے کہ جس وقت جو سورہ بھی نازل کی گئی ہے وہ اس غرض کے لیے نازل کی گئی ہے کہ جو معاملات محتاج توضیح و تشریح ہیں ان کی توضیح و تشریح کر دی جائے اور کلام ایسا ہو کہ اس کے نظم میں کسی قسم کا التباس و ابہام نہ ہو۔ جس طرح ایک ماہر اور حکیم خطیب اپنے سامنے کے خاص حالات و مقتضیات کی بنا پر ایک خطبہ دیتا ہے کہ بسا اوقات وہ ایک خاص معاملہ کا ذکر اگرچہ نظر انداز کر دیتا ہے لیکن اس کا کلام اس طرح کے تمام احوال و معاملات پر حاوی ہوتا ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ذکر تو کسی خاص معاملہ یا کسی خاص شخص کا کرتا ہے لیکن کلام ایک عالمگیر بارش کی طرح بالکل عام و ہمہ گیر ہوتا ہے، اسی طرح قرآن حکیم کا نزول بھی ہوا ہے، جیسا کہ قرآن مجید سے خود مترشح ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے وَ اِنْ تَسْئَلُوا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرآنُ تُبْدَلَكُمْ (اور اگر تم ان کے متعلق ایسے وقت میں سوال کرو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ ظاہر کر دی جائیں گی) اس سے معلوم ہوا کہ قرآن عین اپنے وقت نزول میں سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے، لوگوں کے سوالوں کے جواب دے دیتا تھا۔ اس طرح جب ایک سورہ اپنی حد کو پہنچ جاتی اور کلام کے تمام تقاضے پورے ہو جاتے تو وہ سورہ تمام کر دی جاتی اور نا ممکن تھا کہ وہ اپنے حدود اقتضا سے ذرا بھی کم و بیش ہو۔

لیکن بسا اوقات ضرورت باقی رہ جاتی تھی تو اس وقت دوسری سورہ نازل کی جاتی۔ شان نزول وہی ہوتی لیکن اسلوب میں تبدیلی کردی جاتی تاکہ یکسانی و یک رنگی سننے والوں کی طبیعت پر بار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے بعثت کی بہت سی سورتوں میں حشر و نشر، توحید، تصدیق رسول اور اس سے ملتے جلتے ہوئے مضامین ملتے ہیں۔ صرف اسلوب اور طرز بیان کا فرق ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ضرورت کسی امر کی توضیح و تشریح کی داعی ہوتی، اس وقت کوئی آیت اترتی اور جہاں ضرورت ہوتی وہ آیت وہیں رکھ دی جاتی۔ یہ اس وعدہ کی تکمیل ہوتی جس کا ذکر سورہ قیامہ میں فرمایا ہے۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی توضیح کرنا) ایسے مواقع پر زمانہ نزول کا لحاظ نہ ہوتا بلکہ نظم کلام کا لحاظ کیا جاتا اور بالعموم اس قسم کی آیات کے بعد یہ تنبیہ بھی کردی جاتی کہ یہ آیت بطور تشریح نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ جو آیتیں اصل احکام کے ساتھ بطور تفسیر ملائی گئی ہیں ان کے بعد بالعموم یہ آیت آئی ہے۔ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ (اسی طرح اللہ اپنی آیتوں کو لوگوں کو سمجھانے کے لیے کھولتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں)

پس اگر تم طمانیت اور یقین کے طالب ہو تو شان نزول کی تلاش میں سر رشتۂ نظم کو ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑنا ورنہ تمہاری مثال صحرا کے اس مسافر کی ہو جائے گی جو اندھیری رات میں ایک چوراہے پر پہنچ گیا ہے اور نہیں جانتا کہ اب کدھر جائے۔ شان نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیے اور احادیث و روایات کے ذخیرہ میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کردیں۔ پھر سب سے زیادہ لائق اہتمام وہ شان نزول ہے جو خود نظم قرآن سے مترشح ہو رہی ہے۔ اس کو پوری مضبوطی سے پکڑو کیونکہ جب کوئی حکم عام کسی خاص حالت و صورت میں نازل ہوتا ہے تو وہ حالت و صورت اس حکم کی حکمت و علت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مثلاً قرآن میں تعدد ازواج اور وحدت ازواج دونوں کا حکم ہے۔ اب اگر تم اس شان نزول کو سامنے رکھو جو نظم کلام

سے نکلتی ہے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ پہلا حکم یتامیٰ کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے اور دوسرا حکم بیویوں کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے اور ان دونوں کے درمیان جامع رشتہ قسط بالضعفاء یعنی کمزوروں کے ساتھ انصاف ہے، اور ان میں سے ترجیح اس حق کو ہو گی جو مقدم ہے- یہی حال رہن کے معاملہ کا ہے- کسی مسلمان کا مال گرو رکھنا ایک نہایت دناءت کی بات ہے- پس ضرورت کے لیے اس کی اجازت دی اور ضرورت رفع ہو جانے کے بعد اس کے لوٹا دینے کا حکم دیا-(م : ۳۵-۳۷)

متشابہات :

عقل انسانی کا علم دو طرح کا ہے- ایک وہ جو حواس سے ماخوذ ہے، اس کے بارے میں عقل فیصلہ کر لیتی ہے- دوسرا وہ جو حواس سے حاصل نہیں ہوتا، عقل اس کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ کرنے سے قاصر ہے- جو چیزیں عقل سے ماوراء ہیں ان پر عقل کوئی حکم نہیں لگاتی البتہ ان کے بارے میں رہنمائی دے سکتی ہے- عقل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر اس کو کچھ جزئیات معلوم ہو جائیں تو ان کی مدد سے وہ کلیات قائم کر سکتی ہے- اس سلسلہ میں عقل نے جن معارف تک جزئیات کی مدد سے رسائی حاصل کی ہے اس پر عقل کے شرف کا قائل ہونا پڑتا ہے-

جہاں تک آخرت کی نعمتوں اور عذاب و ثواب کا تعلق ہے ان کا علم حواس سے ماخوذ نہیں- یہ عقل سے ماورا ہے- عقل کے پاس ان کی جزئیات تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں- البتہ اگر مجموعی طور پر ان کی تصویر کشی کر دی جائے تو یہ حقائق عقل کی گرفت میں آ سکتے ہیں- اب اگر ایک صاحب تخیل آدمی آخرت کے احوال کو مشخص کر کے تصور میں لانے کا حیلہ کرے تو لوگ اس کو جھٹلانے لگتے ہیں- چنانچہ کفار نے جب نبی ﷺ کی زبان سے یہ بات سنی کہ گناہ گاروں کو زقوم کھانے کو دیا جائے گا جس کا درخت جہنم کے پیندے میں اگے گا تو انہوں نے اس کا مذاق اڑایا اور کہا کہ یہ بات ہمارے خیال میں نہیں آ سکتی کہ درخت ہو اور وہ

آگ کے اندر اگے۔

لیکن وہ لوگ جو علم میں پختہ کار ہوتے ہیں وہ عقل کی رسائی کی حدود سے واقف ہوتے ہیں۔ انہوں نے ان جزئیات سے کلی علم حاصل کیا اور ان کو پیغمبر کی ہر بات کا یقین آگیا۔ ایسے لوگ عذاب اور ثواب کی مثالوں کے اندر سے عمومی صفات اخذ کر لیتے ہیں۔ مثلاً آگ الم ناک سزا کی تعبیر کے لیے ہے۔ آگ کے ستونوں اور گلے میں بٹی ہوئی رسی کا مفہوم جبر وقہر ہے۔ ناک کو داغنا، چہرے کو جھلسنا اور اس پر سیاہی متکبرین کی تذلیل کے لیے ہے۔ قرآن کی یہ تعبیریں کلام عرب کے اسلوب کے عین مطابق تھیں۔ ان کا مذاق اڑانے والے احمقوں نے محض شرارت اور حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان پر اعتراض کیا۔

متشابہات کو سمجھنے کا یہ نہایت واضح طریقہ ہے کہ ان کو متشخص کر کے حقیقت نہ سمجھ لیا جائے۔ اہل علم کی اکثریت کا مذہب یہی ہے۔ صاحب لسان العرب لکھتے ہیں :-

"متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جو قیامت اور حیات بعد الموت کے ضمن میں نازل ہوئیں۔ مثلاً آیت وقال الذین کفروا هل ندلکم علی رجل ینبئکم اذا مزقتم کل ممزق انکم لفی خلق جدید افتری علی الله کذبا ام به جنة یا آیت وقالوا ء اذا متنا و کنا ترابا و عظاما ء انا لمبعوثون او اٰباؤنا الاولون۔ یہ حقیقت تھی جو ان کو شبہ میں ڈالتی تھی تو اللہ تعالٰی نے ان کو حقیقت سے اس پہلو سے آگاہ کیا جس کی دلیل پر اگر وہ غور کرتے تو یہ متشابہ امر بالکل سامنے کی حقیقت بن کر ان کو نظر آتا۔ چنانچہ فرمایا وضرب لنا مثلا و نسی خلقه قال من یحیی العظام و هی رمیم قل یحییها الذی انشاها اول مرة وهو بکل خلق علیم الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارا فاذا انتم منه توقدون اولیس الذی خلق

السماوات والارض بقادر علی ان یخلق مثلھم- مطلب یہ کہ جب تم ابتدائے آفرینش کا اقرار کرتے ہو تو حیات بعد موت اور حشر و نشر کا انکار کیوں کرتے ہو- کثیر اہل علم کا قول یہی ہے اور یہ نہایت واضح ہے- اس قول پر دلیل آیت فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ ہے- اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کا مطالبہ یہ ہے کہ آخرت کی بعثت اور زندگی کی حقیقت ان کو بتائی جائے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی حقیقت اور اس کے وقت کو اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں جانتا- اس پر دلیل یہ آیت ہے ھل ینظرون الا تاویلہ یوم یاتی تاویلہ یہاں تاویل سے مراد قیام قیامت اور حشر و نشر کا وعدہ ہے- اللہ اعلم"-

انہی متشابہات کی مانند کچھ ایسے امور بھی ہیں جن کی حقیقت کے درپے ہونے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ان کے سبب سے فتنہ میں پڑنے کا احتمال نہیں ہوتا جب تک کہ آدمی غلو میں نہ پڑ جائے یا اس کی عقل پر وہم غالب نہ آگیا ہو- ہم ان کے تذکرہ اور ان کی تاویل کے طریقہ کے بیان پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں-

قرآن میں لوگوں کی صفات کا ذکر ہوا ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ ان صفات کے موصوف کون لوگ ہیں- اسی طرح بعض واقعات کی طرف تلمیح پائی جاتی ہے- صفات کو اس طرح عام رکھنے اور واقعات کی نشاندہی کے بغیر تلمیح سے کام لینے کی حکمت ہر غور کرنے والے پر ظاہر ہو جاتی ہے- وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ رہنمائی کا بلیغ ترین انداز ہے اور دینی امور میں جمود سے محفوظ رکھتا ہے- وہ لوگ جو آیات کے فہم کے درپے ہوتے ہیں اور تاریخ پر بھی ان کی نظر ہوتی ہے تو کبھی کبھی عمومی صفات کا مصداق ان کی سمجھ میں آجاتا ہے- وہ کسی خاص واقعہ کو بھی متعین کر لیتے ہیں جس کی بدولت کلام کا ربط، آیات اور سورتوں کے مواقع نزول اور نظم کا حسن ان کی گرفت میں زیادہ آجاتا ہے- یہ چیز ایسی ہے جس کے حق میں قرآن کی

نص موجود نہیں- لیکن اس کے اندر اختلاف کی نوعیت بھی امت کے اس اختلاف کی نہیں ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں بچنے کا حکم دیا ہے اور جو گناہ ہے- ہم دیکھتے ہیں کہ سلف ان چیزوں میں مختلف آراء رکھتے تھے لیکن دوسروں پر نکیر کرتے تھے نہ ان کی تردید کرتے تھے- اس طرح کی آیات کی تاویل میں مامون مسلک یہ ہے کہ سلف کے اقوال کو تطبیق دی جائے- مثال کے طور پر شق قمر کے معجزہ کے وقوع کے بارے میں کسی نے دیکھا کہ چاند کوہ قبیس پر تھا- کسی نے اس کو جبل حرا پر دیکھا- تو ان کے دیکھنے کے مقام کے فرق کی بنا پر اختلاف ہوا- اسی طرح گرنے والے ٹکڑے کے بارے میں موقع و محل کا اختلاف ان کے اختلاف منظر کے باعث ہوا-(ر: ۲۳۵-۲۳۸)

تفسیر قرآن کے اصول

قرآن مجید کی تفسیر کے اصول تین قسموں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

(ا) بنیادی اصول، جن کا سہارا اس وقت لیا جائے گا جب عبارت کے ایک سے زیادہ معانی لینے کا احتمال نہ ہو۔ ان کو بالعموم اختیار کیا جانا ضروری ہے۔

(ب) ترجیح کے اصول، جو اس وقت اختیار کیے جائیں گے جب ایک مقام پر کئی مفہوم لینا ممکن ہو۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہم متعین کر سکیں گے کہ کونسا مفہوم ترجیح کے لائق ہے اور کس کی حیثیت مرجوح کی ہے۔

(ج) غلط اصول، جن پر لوگوں نے تفسیر میں اعتماد کر لیا حالانکہ انکی حیثیت ایسی نہ تھی کہ ان پر اعتماد کیا جاتا۔ ان کا تذکرہ ہم صرف اس لیے کریں گے کہ لوگ ان سے اجتناب کریں۔

ا- بنیادی اصول

قرآن کی تفسیر کے بنیادی اصول چار ہیں :-

(i) نظم کلام اور سیاق و سباق کا لحاظ

(ii) نظائر قرآن کی روشنی میں مفہوم کا تعین

(iii) کلام میں مخاطب کا صحیح تعین

(iv) الفاظ کے شاذ معانی کا ترک

اگلے صفحات میں ہم ان کی ضروری وضاحت کریں گے۔

(i) نظم کلام اور سیاق و سباق کا لحاظ

یہ اصول بنیادی اس لیے ہے کہ کوئی بھی کلام ایسے مفہوم کا متحمل نہیں ہو سکتا جو اس کے نظام کے مخالف اور اس کے معانی کو غیر مربوط کرنے والا ہو۔ ربط کلام تو ہر عاقل کے کلام کی خصوصیت ہوتی ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کا معجز کلام اس خصوصیت سے خالی کیسے ہو سکتا ہے؟ تفسیر کا یہ اصول نہایت واضح تھا لیکن بعض منحرف لوگوں نے اس کو ختم کرنے کی کوشش کی اور بعض حدیثیں ایسی گھڑ دیں جن کے باعث ناپختہ عقل رکھنے والے صالح اہل ایمان بھی فتنہ میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ ان کو معاف فرمائے، اعمال کا دارومدار تو لوگوں کی نیتوں پر ہوتا ہے۔ نظم کلام کو نظر انداز کر کے تفسیر کرنے کی ایک نمایاں مثال آیت تطہیر ہے[15]۔ یہ نہ امہات المومنینؓ کے علاوہ کسی کے حق میں نازل ہوئی، نہ اس کا کسی اور سے تعلق ہے اور ان کے سوا کوئی اس میں شامل ہے۔ موقع کلام ایسا ہے کہ اس کے حکم کو عام کیا ہی نہیں جا سکتا۔

نظام اور مناسبت میں فرق :

بعض علماء نے آیات اور سورتوں کی باہمی مناسبت کے باب میں کئی تصانیف چھوڑی ہیں لیکن نظم قرآن کے باب خاص میں کوئی تصنیف میرے علم میں نہیں آئی۔ میرے

نزدیک نظام اور مناسبت میں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ مناسبت نظام کا محض ایک حصہ ہوتی ہے کیونکہ آیات کی باہمی مناسبت کلام کے بارے میں کوئی مستقل بالذات چیز واضح نہیں کرتی۔ایک ایسا شخص جو محض مناسبت کا متلاشی ہو وہ آیات کی کسی بھی مناسبت پر قناعت کر سکتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ اول تا آخر پورے کلام کو منظم کرنے والی مناسبت سے غافل ہو سکتا ہے۔ایسا شخص پاس پاس کی ایسی دو آیتوں میں بھی مناسبت تلاش کرنے لگے گا جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہو بلکہ ان میں سے ایک آیت کسی سابقہ سلسلۂ بیان سے متعلق ہو۔ قرآن مجید میں اس طرح کے بے شمار مواقع ہیں۔ان مواقع پر بڑے ذہین لوگوں کو بھی آیات کی باہمی نسبتیں معلوم کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔اور جب پاس کی آیات میں ان کو ربط نظر نہ آیا تو انہوں نے ان کے درمیان کسی مناسبت ہی کا انکار کر دیا، حالانکہ ان آیات کا تعلق اوپر کچھ فاصلے پر وارد ہونے والے کسی مضمون سے تھا۔

نظم سے ہماری مراد سورہ کے اجزاء کی وہ باہمی مناسبت ہے جس کے معلوم ہونے پر پوری سورہ ایک وحدت میں ڈھل جائے۔اس صورت میں کلام کا مفہوم اس قدر مربوط اور ایک ہی مرکزی مضمون کا حامل نظر آتا ہے کہ پوری سورہ مشخص ہو کر سامنے آتی ہے اور کلام میں ایک جمال، ایک پختگی اور وضاحت کا ادراک ہوتا ہے۔ نظم محض ایک سورہ تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس سورہ کی مناسبت ان سورتوں کے ساتھ معلوم ہو جائے جو اس کے ساتھ متصل ہیں۔اگر ان کے ساتھ ان کی مناسبت واضح نہ ہو تو ان سورتوں کے ساتھ اس کا تعلق معلوم ہو جائے جو اس سے پہلے یا بعد میں کچھ فاصلے پر واقع ہیں۔کیونکہ عین ممکن ہے کہ جس طرح بعض آیات جملہ معترضہ کے طور پر کلام میں آجاتی ہیں اسی طرح بعض سورتیں بھی معترضہ سورتیں بن کر آئی ہوں۔ نظم معلوم ہو جانے کے بعد اول سے آخر تک پورا قرآن مناسبت و ترتیب رکھنے والا اور کامل وحدت سے متصف نظر آئے گا۔اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ نظم محض مناسبت یا محض ترتیب اجزاء سے زائد ایک

چیز ہے-

وحدانیت :

نظام وہی قابل قبول ہو سکتا ہے جو پوری سورہ کو ایک وحدت عطا کرے اور اس کے تمام اجزا ایک خاص مرکزی مضمون، جس کو ہم عمود کہیں گے، سے مربوط ہو جائیں- لہذا نظم کے متلاشی کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ کلام کے سیاق پر غور کرے- ہر سورہ میں مختلف مطالب ہوتے ہیں- یہ متعین نہیں ہو پاتا کہ یہ مطالب کس عمود کی طرف لے جا رہے ہیں- جب تک کلام کے سیاق و سباق کو نہ سمجھا جائے اس کے مختلف حصوں کا باہمی تعلق سمجھ میں نہیں آتا- لہذا یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ پہلو جان لیے جائیں جو ان مختلف حصوں کو ایک لڑی میں پرو دیں-

فی الجملہ کلام کا نظام ہی سورہ کو وحدانیت عطا کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ ایک کامل و مستقل بالذات وحدت بنتی ہے، جس کا ایک عمود ہوتا ہے اور جس کی طرف اس کے تمام اجزاء پلٹتے ہیں-

وحدانیت، مناسبت اور ترتیب کے لحاظ سے کلام کے کئی درجے ہوتے ہیں- ایک کلام وحدانیت رکھتے ہوئے بھی تناسب و ترتیب سے خالی ہو سکتا ہے- مثال کے طور پر ایک کتاب پند و نصائح کی جامع ہے- اس میں دین و اخلاق اور معاشرت و سیاست سے متعلق متعدد اقوال بغیر کسی ترتیب کے جمع کر دیئے گئے ہیں- یہ کتاب گو وحدانیت سے خالی نہیں ہو گی (اس کی وحدانیت کمزور سہی کیونکہ یہ تمام تر پند و نصائح کے باب میں ہے) لیکن اس میں تناسب و ترتیب کا فقدان ہو گا- اب اس کتاب کے اقوال کو دین و اخلاق وغیرہ کے الگ الگ ابواب میں تقسیم کر کے کتاب تصنیف کر دو تو گو اس کتاب میں تناسب ہو گا لیکن وحدانیت حسب سابق کمزور رہے گی- انہی نصائح کو کلیلہ و دمنہ[19] کے انداز پر ایک جامع قصہ کی شکل میں جمع کر دو تو مجموعی طور پر اگرچہ یہ تصنیف کمزور وحدت رکھتی ہو گی لیکن الگ الگ اس کے ہر باب میں

وحدت پائی جائے گی۔ پند و نصائح کے اسی مواد کو جب حسن ترتیب اور مناسبت کے ساتھ ابواب میں تقسیم کرو گے اور کلام کو اس طرح مرتب کرو گے کہ ہر باب میں ایک ہی مضمون بیان ہو اور یہ تمام کا تمام ایک خاص موضوع سے متعلق ہو جائے اور اس کے تمام اجزاء میں باہمی مناسبت پیدا ہو جائے تو اب یہ کتاب کامل نظام رکھنے والی ہو گی۔ گویا کلام کے حسن ترتیب اور حسن تناسب کے ساتھ ساتھ ایک مضبوط وحدانیت بھی حسن نظام کی ایک لازم شرط ہے۔(ر :۸۸-۸۹)

نظام کی متعدد ممکنہ صورتیں :

نظام کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ اکثر لوگ اس کا ادراک کرنے سے عاجز رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی سورتوں کا نظام تم بالکل واضح پاؤ گے۔ یہی نہیں بلکہ بعض سورتوں اور عبارتوں کا نظام ایک سے زیادہ پہلوؤں سے سامنے آتا ہے۔ نظام کی ان کثیر ممکنہ صورتوں کے سامنے آجانے میں کوئی حرج نہیں۔ جس طرح ایک ہی معاملہ میں حکمت کے متعدد پہلو ہونے میں کوئی تضاد نہیں اسی طرح کلام کی مناسبتوں کے متعدد پہلو ممکن ہونے میں بھی کوئی تضاد نہیں۔ لہذا بعض سورتوں کے نظام کی تاویل کئی شکلوں میں کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ البتہ اصل مشکل اس بات کے تعین میں پیش آتی ہے کہ صحیح مقصود نظام کون سا ہے جو کلام میں ایک وحدت پیدا کر دے اور اس کو آگے اور پیچھے کے کلام کے ساتھ مربوط کر دے۔ اگر یہ بات متعین کی جاسکے تو اس کی کثرت مناسبت کے جو بھی پہلو سامنے آئیں ان میں کوئی خرابی نہیں ہے۔(ر :۹۱)

قرآن میں نظم کلام کی مشکلات

متعدد وجوہ ایسی ہیں جن کے باعث قرآن کا نظم یا تو واقعی مخفی ہو گیا ہے یا قاری سے مخفی رہتا ہے۔ ان وجوہ میں سے بعض کا تعلق کلام کی خصوصیات سے اور بعض کا خود قاری کی ذات سے ہے۔ ہم یہاں چند نمایاں وجوہ کی طرف اشارہ کریں گے۔

خصوصیات کلام پر مبنی وجوہ :

۱- کلام کے بعض اجزاء کو بیان میں اس لیے حذف کر دیا جاتا ہے کہ ان کی طرف رہنمائی بیان کردہ اجزائے کلام سے خو ملی ہو رہی ہوتی ہے- اگر یہ حذف کسی قصہ میں ہو تو محذوف جزء ایک غبی اور کند ذہن آدمی کے سوا ہر شخص پر واضح ہوتا ہے- سورہ یوسف میں قصہ کے حذف کی متعدد مثالیں موجود ہیں[۱] - جب حذف دلائل یا امثال میں ہو تو محذوف کسی ایسے شخص پر مخفی نہیں رہ سکتا جس کا ذہن بیدار اور عقل روشن ہو، جیسا کہ اکثر اہل عرب کا حال تھا- اگر عربوں کے اشعار، ان کے خطبے، مسجع کلام اور حکیمانہ اقوال ہم تک نہ پہنچے ہوتے تو ہم ان کو بھی دوسری اقوام ہی کی صف میں رکھتے- لیکن جب ہم ان کے ایسے افراد کا شاندار کلام دیکھتے ہیں جو لکھنا پڑھنا تک نہیں جانتے تھے یا ان کی خواتین کا کلام، بالخصوص وہ کلام جو ارتجالاً کہا گیا، دیکھتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ اہل عرب نہایت ذہین تھے- وہ بات کو اجزائے کلام کے پورا ہونے سے پہلے ہی سمجھ جاتے، طول کلام کو عیب سمجھتے اور ایجاز و اختصار ان کو پسند تھا- قدیم اہل یونان میں سے اسپارٹا کے لوگ اپنے بعض اخلاق میں عربوں سے مشابہ تھے- ان کے کلام کو دیکھو تو اس میں عربوں کے کلام کی خصوصیات نظر آئیں گی-

۲- بعض اوقات کلام میں حذف نہیں ہوتا لیکن بظاہر اس کا گمان ہوتا ہے- جس مضمون کے محذوف ہونے کا شبہ ہوتا ہے وہ آگے آنے والی آیات میں دوسرے اسلوب میں بیان کر دیا جاتا ہے- اگر اس کو پہلے بیان کر دیا جاتا تو وہاں وہ زائد از ضرورت ہوتا- اس کے برعکس کہیں ایک ہی بات کو دوبارہ کہا گیا ہے جس کا مقصد تاکید ہے- مثلاً فرمایا :

فلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَة وَمَا ادرٰكَ مَاالعقبه فكُّ رَقبة اَو اِطعَام فِى يَوم ذِى مَسغبَة (البلد ۱۱-۱۳)

(پر اس نے گھاٹی نہیں پار کی اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ گھاٹی- گردن کو چھڑانا یا

بھوک کے زمانے میں کھلانا)

اسلوب میں اس طرح کی تبدیلیاں قرآن کی خصوصیات میں سے ہیں- ایسے مقامات نحویوں کے لیے تو ایک مصیبت کھڑی کر دیتے ہیں لیکن ان کی بدولت بیان نہایت آسان، واضح اور شیریں ہو جاتا ہے-

۳- متکلم کی مزاجی کیفیت سے ناواقفیت بھی فہم نظم میں مشکل پیدا کرتی ہے- متکلم کبھی غصہ میں ہوتا ہے، کبھی حقارت یا حسرت سے بات کرتا ہے، کبھی وہ مخاطب سے منہ پھیر کر بات کرتا ہے- کلام میں ان جذبات کے اظہار کی مخفی علامات موجود ہوتی ہیں لیکن جو شخص واقف حال نہیں ہوتا وہ ان پر مطلع نہیں ہونے پاتا- جو چیزیں اس کی طرف رہنمائی کرتی ہیں وہ کلام کا اسلوب اور اس کے معانی دونوں ہیں- اسلوب میں استفہام کا انداز، خطاب کا طرز، سرعت التفات، کلام کی درشتی اور اس کا طول وغیرہ شامل ہیں- مثال کے طور پر سورہ نساء کی آیت ۱۵۵ فبما نقضهم میثاقهم و کفرهم بایات الله اور اس کے بعد کی آیات پر غور کرو[۱۸]-

ان امور کے لیے کلام میں اگرچہ ظاہری علامات ہوتیں تو اہل عجم کے لیے ان سے رہنمائی کا سامان ہو جاتا لیکن یہ چیز اعجاز کلام کی نوعیت کی ہے- اس کا تعلق کلام کی روح سے ہوتا ہے، جس کی طرف رہنمائی لمس قلب کی ضرورت ہی کر سکتی ہے- سننے والا کلام کے مدلول کو سمجھ جاتا ہے لیکن ایک مصنوعی ادیب پر اس کی حقیقت نہیں کھلتی-

اگر کسی شخص کے اندر یہ خاصیت پائی جائے کہ وہ ایک ایسا کلام پیش کرنے پر قادر ہو جس میں حسرت، غضب، شفقت وغیرہ جذبات کا اظہار بے حد زیادہ ہو حالانکہ اس کی اپنی کیفیت اس کے برعکس ہو تو ایسا شخص سب سے بلیغ اور وسیع تخیل کا مالک شمار ہوتا ہے اور یہ خصوصیت کلام کا سحر ہوتی ہے- ایسے شخص کے کلام کی

خصوصیات کا حامل کلام کہنا دوسرے لوگوں کے لیے اگرچہ مشکل ہوتا ہے لیکن ممکن ضرور ہے۔

ایک شخص اگر کسی بادشاہ یا حکیم کا کلام اس کے شکوہ، کبریائی اور رفعت کو ملحوظ رکھ کر اسی کی طرح کہنے پر قادر ہو جائے کہ وہ سننے والوں کو بھی شبہ میں ڈال دے تو ایسا شخص فن خطابت کے بلند ترین مرتبہ کا حامل ہوتا ہے۔ البتہ اس کا عیب بھی کبھی کبھی ظاہر ہو جاتا ہے، جیسا کہ کہاوت ہے۔ لیس التکحل فی العینین کالکحل (آنکھوں میں سرمہ لگانا ان کی قدرتی سیاہی کا بدل نہیں ہوتا) یا المرء مخبوء تحت لسانه (آدمی کی شخصیت کی پہچان اس کی زبان سے ہو جاتی ہے) اگر عیب کلام سے ظاہر نہ بھی ہو جب بھی کلام پیش کرنے والا شخص بادشاہ ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ دونوں دو مختلف انسان ہیں۔

اگر کوئی شخص کلام الٰہی کی نقل کرنے کی جسارت کرے اور اپنے اس کلام کو ایسے دانشوروں، خطیبوں اور شاعروں کے سامنے پیش کرے جو کلام الٰہی کو پہچانتے اور اس کی روشنی میں اس شخص کے کلام کا تنقیدی جائزہ لے سکتے ہوں تو عقل یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی کہ یہ لوگ کلام میں بلندی کی جگہ پستی اور اس کے انداز میں آدمی کے دعوئ کے برعکس مختلف انداز کلام کو بھانپ نہ سکیں۔ ملٹن (Milton) جیسے ادیب نے یہ غلطی کی ہے کہ شیطان کے کلام کو بھی وہی انداز دے دیا ہے جو صرف رب کے کلام کو زیبا ہے۔

پھر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ قرآن نے اللہ تعالیٰ کے جلال، اس کی عظمت شان اور اس کے اقتدار کی قوت کو اس طور سے نمایاں کیا ہے کہ جس کی مثال کسی دوسرے دین میں نہیں ملتی۔ کلام الٰہی کا انداز بھی اسی کے علوئے شان کے عین مطابق ہے اور اس کی منزلت سے کسی طرح کم تر نظر نہیں آتا۔ اس کلام پر یہ آیت بالکل صادق آتی

ہے-

لو انزلنا هذا القرآن على جبل لرايته خاشعا متصدعا من خشية الله و تلک الامثال نضربها للناس لعلهم يتفكرون -(حشر:۲۱)

(اگر اس قرآن کو ہم کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ خشیت الٰہی سے پست اور پاش پاش ہو جاتا اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سوچیں)

اہل عرب نے قرآن کے اندر رفعت و شکوہ محسوس کیا تو پہلے اس کو شعر کی طرف نسبت دی کیونکہ وہ شعر ہی کو دلوں کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والی چیز سمجھتے تھے- پھر جب وہ اس نسبت سے خود مطمئن نہیں ہوئے تو انہوں نے قرآن کو سحر قرار دیا- ان کا خیال یہ بھی ہوا کہ یہ جنوں کا کارنامہ ہے اسی لیے انہوں نے نبی ﷺ کو مجنون کہنا شروع کر دیا-

۴- قرآن میں کہیں کہیں متفرق آیات آتی ہیں، پھر ان کے بعد کوئی ایسی حقیقت بیان ہوتی ہے جو ان متفرق آیات کو جمع کر لیتی اور ان میں وحدت پیدا کر دیتی ہے- تب معلوم ہوتا ہے کہ وہ متفرق آیات بعد میں بیان ہونے والی حقیقت کی تمہید کے طور پر تھیں-اس کی مثال سورہ بقرہ کی آیات ۱۵۹ تا ۱۷۷ میں دیکھی جا سکتی ہے-

۵- نظم کے مخفی ہونے کا ایک پہلو یہ ہے کہ تمہیدی مضامین اور معترضہ جملے عام انداز میں بیان ہوئے ہیں- جبکہ ایسے مقامات پر کلام کا رخ کسی خاص جانب کو ہے-ایسے مواقع پر لازم ہوتا ہے کہ عام کو بھی اس کی خاص جہت کی طرف لوٹایا جائے-

۶- متعدد مقامات پر کلام میں مختلف معانی کا احتمال ہوتا ہے لیکن موقع ایسا ہوتا ہے کہ بات کو خاص کر دینا مقصود نہیں ہوتا-کچھ چیزیں تو ہیں ہی ایسی کہ جن میں اشتباہ کو برقرار

رکھنا ہی مطلوب ہے۔ مثلاً قیامت کی گھڑی جس کا وقت واضح نہیں کیا گیا۔
(ر: ۱۳۵-۱۳۷)

قاری کے فہم پر مبنی وجوہ:

۱۔ مفسر کو کسی خاص فن سے تعلق یا اس میں اختصاص بھی نظم قرآن کو مخفی کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔ علم کلام میں شغف رکھنے والا ہر چیز میں مسئلہ جبر و قدر کا حل تلاش کرے گا، جیسا کہ امام رازیؒ کی تفسیر میں تم دیکھتے ہو۔ صوفیانہ مزاج کا حامل مفسر ہر آیت میں روح کی حقیقت اور باری تعالیٰ کے ساتھ اس کی نسبت کو تلاش کرتا نظر آئے گا۔ ایک فقیہ فروعی احکام کو زیادہ اہمیت دے گا۔ ایک محدث غیر مشہور روایات کو بھی جید قرار دے کر کوئی ایسی چیز پیش کر دے گا جس سے نظم قرآن کا سر رشتہ گم ہو کر رہ جائے۔

۲۔ شک میں مبتلا ایسے کثیر لوگ ہیں جو کسی ایک رائے پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ مختلف اقوال کو تفسیر کے طور پر جمع کر لیتے ہیں۔ ان مختلف اقوال کے اندر سے ایک ایسا قول برآمد کرنا مشکل ہو جاتا ہے جس سے نظم کلام درست ہوتا ہو۔

۳۔ بعض لوگ کسی خاص مقصد سے قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ الفاظ کو پھیر کر اپنے مطلب کے ایسے معانی پہنا دیتے ہیں جن کی قرآن میں کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ وہ ہر کمزور معنی پر، جو ان کی موافقت میں ہو، اعتماد کر لیتے ہیں اور ہر اس واضح معنی سے، جو ان کے غیر موافق ہو، آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

۴۔ نظم قرآن کے مخفی رہنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مدنیت کے تقاضوں سے لوگوں کی طبائع ان لوگوں سے بے حد مختلف ہو چکی ہیں جن پر قرآن نازل ہوا تھا۔ شہریوں کے اندر خاص میلانات پیدا ہو جاتے ہیں، طبیعتیں ایک غیر فطری سانچے میں ڈھل جاتی ہیں جو اس فطری سادگی سے کوسوں دور ہوتا ہے جو آزاد فضا میں رہنے سے حاصل

ہوتی ہے اور جس میں کوئی کجی نہیں ہوتی۔

قرآن میں گہرائی ہے لیکن اس کے باوجود وہ محدود و مقید نہیں ہے۔ چونکہ اس کا سرچشمہ فطرت سے پھوٹتا ہے اس لیے اس میں رفعت بھی ہے اور وسعت بھی۔ شہری اور بدوی عقل میں وہی فرق ہے جو ان کی بصارت میں ہے۔ شہریوں میں تم زرقا[19] کو پاؤ گے نہ ابن حلزہ[20] کو اور بدویوں میں تمہیں کوئی حریری[21] نہیں ملے گا جو غیر مانوس الفاظ اور منقش زبان لکھتا ہو۔(ر: ۷ ۱۳-۱۳۸)

تلاش نظم میں ممد اہم اشارات

ہر کلام کے نظم کو، اور بالخصوص کلام وحی کے نظم کو، جاننے کے لیے خاص اصول ہیں۔ مثلاً:

الف۔ ایک بات یا تو ایک ہی جملے میں ادا ہو جاتی ہے یا متعدد ایسے جملوں میں جن کا موضوع ایک ہی ہوتا ہے۔

ب۔ بعد میں آنے والا جملہ پہلے آنے والے جملے سے جڑا ہوتا ہے۔اس کے جڑا ہونے کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔یا تو بعد کا جملہ سابقہ جملہ کے موضوع میں مشترک ہوتا ہے یا اس کے کسی خاص جزو سے ملا ہوا ہوتا ہے یا اس کا موضوع پہلے جملہ کے موضوع کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔

ج۔ بعد میں آنے والے جملے کا تعلق کبھی تو سابقہ جملہ کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اس سے اوپر کے کسی جملہ یا مضمون سے مربوط ہو۔

ان اصولوں سے کئی چیزیں متفرع ہوتی ہیں، جن کو آئندہ صفحات میں ہم واضح کریں گے۔

قرین پر غور:

قِران سے مراد دو کلمات یا دو اقوال کا ساتھ ساتھ آنا ہے، خواہ یہ حرف عطف کے

ساتھ ہو یا اس کے بغیر - اس طرح ساتھ ساتھ آنے والے الفاظ یا جملے ایک دوسرے کے قرین کہلاتے ہیں - قرین کا پایا جانا مختلف معانی کی طرف رہنمائی کرتا ہے، مثلاً :

الف- ایک قرین دوسرے کی وضاحت یا اس کے مضمون کی تاکید کرتا ہے - متعدد صفات باری تعالیٰ اسی مقصد کے لیے ساتھ ساتھ آتی ہیں - مثلاً عزیز مقتدر (زبردست اور ہمہ گیر اقتدار والا) العزیز الجبار (غالب اور زور آور) اور عزیز ذوانتقام (غالب اور انتقام لینے والا)

کسی خاص صفت کے ساتھ کئی صفات کا بطور قرین آنا اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ وہ مختلف صفات ایک ہی جامع امر کے تحت ہیں - مثلاً عزیز کی صفت رحیم، علیم، حکیم اور غفار کے ساتھ آئی ہے - اس سے معلوم ہوا کہ صفت رحمت، حکمت، علم اور غفران ایک ہی جامع صفت کے پرتو ہیں -

ب- دو قرین کسی ایک معنی میں مشترک ہوتے ہیں - مثلاً فرمایا :

الشمس والقمر بحسبان والنجم والشجر یسجدان

(رحمٰن : ۵-۶)

(سورج اور چاند ایک حساب سے گردش کرتے ہیں اور ستارے اور درخت بھی سجدہ کرتے ہیں)

یہاں دو متصل جملوں میں حسبان اور یسجدان کے الفاظ لا کر اس بات پر دلیل قائم کی گئی ہے کہ یہ سب چیزیں خدا کے آگے مسخر بھی ہیں اور اس کی عبادت میں بھی لگی ہوئی ہیں - سورج اور چاند کا ایک معین نظام میں حرکت کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ وہ کسی حاکم کے تحت ہوں جس نے ان کو اس خدمت پر لگا رکھا ہو - لہذا یہ دونوں اس کی عبودیت میں ہیں اور اس کے تخت شاہی کے آگے سر بسجود رہتے ہیں - عالم جمادات کی ان دو واضح نشانیوں کے بعد عالم نباتات کے سجدہ کا ذکر کر کے متنبہ کر دیا کہ اسی طرح عالم حیوانات بھی خدا کے آگے

سرنگوں رہتا ہے۔اس مضمون کی وضاحت دوسری جگہ کر دی۔فرمایا:

الم تر ان الله یسجد له من فی السماوات و من فی الارض والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدواب و کثیر من الناس۔ (الحج:۱۸)

(کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ کے آگے جھکتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور لوگوں میں سے بہتیرے) (ر:۱۵۹)

ج- ایک قرین جب دوسرے کے موافق ہوتا ہے تو اس کی تائید کرتا ہے اور غور کرنے پر ان کی مماثلت سمجھ میں آتی ہے۔ مثلاً مواسات یا انسانی ہمدردی کا ذکر ایک مقام پر نماز کے ساتھ آیا ہے اور دوسری جگہ ایمان باللہ یا ایمان بلآخرۃ کے ساتھ۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نماز اور ایمان ایک ہی باب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً فرمایا:

قالوا لم نک من المصلین و لم نک نطعم المسکین

(مدثر:۴۲-۴۳)

(وہ جواب دیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے اور نہ غریبوں کو کھلاتے ہی تھے)

انه کان لا یؤمن بالله العظیم ولا یحض علی طعام المسکین (الحاقہ:۳۲-۳۳)

(یہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور نہ مسکینوں کو کھلانے پر لوگوں کو ابھارتا تھا)

اره یت الذی یکذب بالدین فذلک الذی یدع الیتیم ولا یحض علی طعام المسکین۔ (ماعون:۲-۳)

(دیکھا تم نے اس کو جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے! وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکینوں کو کھلانے پر نہیں ابھارتا)

ان تمام آیات کو سامنے رکھ کر ہم اس نتیجہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں کہ ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ، نماز اور مواسات سب کا تعلق ایک ہی اصل سے ہے۔

اسی طرح عمل صالح کا ذکر کہیں ایمان کے قرین کی حیثیت سے ہوا ہے، کہیں تقویٰ کے قرین کی حیثیت سے، جس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ اور ایمان ایک ہی شے ہیں۔ شرک کا ذکر شہادت زور (جھوٹی گواہی) کے ساتھ بھی ہوا اور زنا کے ساتھ بھی۔ اس سے ان چیزوں کی ایک دوسرے کے ساتھ معنوی مناسبت واضح ہوتی ہے۔(ر:٧٦)

اس اسلوب کی روشنی میں ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ دو قرینوں میں سے اگر ایک فنا ہو گا تو دوسرا قرین بھی باقی نہیں رہ سکتا اور ایک چیز اگر باقی رہے گی تو دوسری کو بھی باقی رکھنے کا باعث ہو گی۔ چنانچہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا ذکر ساتھ ساتھ کرنے اور کبھی صلوٰۃ کو زکوٰۃ پر اور کبھی زکوٰۃ کو صلوٰۃ پر مقدم کرنے میں یہی مصلحت ملحوظ ہے۔ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر ان میں سے ایک چیز فنا ہو جائے گی تو دوسری بھی باقی نہیں رہ سکتی۔

قرآن ہمیں اس اسلوب کے ذریعے دو چیزوں کے اثرات کی مماثلت سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ اسی لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ترک صلوٰۃ کے اثر کے حوالہ سے ترک زکوٰۃ کے اثر پر استدلال کیا اور ان لوگوں پر کفر کا حکم لگایا جنھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تھا۔ قرآن اور حدیث دونوں میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ کفار کے ساتھ جنگ اس وقت تک جاری رکھی جائے گی جب تک وہ نماز کا اہتمام نہیں کرتے اور زکوٰۃ ادا نہیں کرنے لگ جاتے۔ (ر:٧٥)

د۔ دو قرین کبھی ایک دوسرے کے مقابل کے طور پر بھی آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات اس طرح آئی ہیں۔ مثلاً العزیز الغفار (زبردست اور بخشنے والا) یا العزیز الرحیم

(زبردست اور رحم کرنے والا) وغیرہ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام صفات باری تعالی اگرچہ ہمیں متضاد نظر آتی ہیں لیکن وہ سب ایک ہی امر کلی کے تحت ہیں۔(ر: ۱۶۰)

مختلف و متضاد چیزوں کو یکجا کر کے بیان کرنے کا ایک فائدہ ان کی حقیقت کو سمجھانا ہوتا ہے کیونکہ اشیاء اپنے اضداد سے اچھی طرح پہچانی جاتی ہیں۔ نیز ایک شے اپنی ضد شے کی نفی کرتی ہے۔ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ کبھی تو وہ متضاد امور کی تصریح کر دیتا ہے اور کبھی محض اشارہ کو کافی سمجھتا ہے۔ اس اصول پر قرآن نے صدقہ اور ربا کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی لیے ربا کا جو اثر آدمی پر پڑتا ہے، صدقہ کا اثر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ چنانچہ ربا کے ضمن میں فرمایا:

الذین یاکلون الربوا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطه الشیطن من المس(بقرہ: ۲۷۵)

(جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے مگر اس شخص کی مانند جس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو)

اس کے برعکس صدقہ کا اثر حق پر دل کو جمائے رکھنا بتایا:

و مثل الذین ینفقون اموالهم ابتغاء مرضاة الله و تثبیتا من انفسهم(بقرہ: ۲۶۵)

(اور ان لوگوں کے عمل کی تمثیل جو اپنے مال اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دلوں کو جمائے رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں یوں ہے-----)

ربا اور صدقہ کو ایک دوسرے کی ضد قرار دینے کے لیے موقع کلام میں اشارات بھی موجود ہیں۔ مثلاً ربا پر اللہ اور رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان کیا گیا جبکہ صدقہ کو اللہ کی رضا کا نام دیا گیا۔ پھر آیت ۲۷۶ میں دونوں کو مقابل رکھ کر فرمایا:

یمحق الله الربوا و یربی الصدقات (بقرہ: ۲۷۶)

(اللہ سود کو گھٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا)   (ر: ۷۵)

اس طرح متضاد امور کو ساتھ ساتھ بیان کرنے کا مقصد اخلاق کی تعمیر اور دلوں کی بیماریوں کا علاج ہوتا ہے۔

۵- ساتھ ساتھ آنے والے دو جملوں میں تعلق علت اور نتیجہ کا بھی ہوتا ہے۔ کبھی علت پہلے بیان ہوتی ہے اور نتیجہ بعد میں، لیکن کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ جب دو امور کے درمیان یہ نسبت معلوم ہو جائے تو جب دونوں میں سے ایک کا ذکر کر دیا جائے تو دوسرے امر کی طرف رہنمائی خود بخود مل جاتی ہے۔ اس کی مثال کے لیے حسب ذیل آیات پر غور کرو:

فاما من طغی و آثر الحیوۃ الدنیا فان الجحیم ھی الماوی و اما من خاف مقام ربه ونھی النفس عن الھوی فان الجنة ھی الماوی (النازعات: ۳۷-۴۱)

(تو جس نے سرکشی کی اور آخرت کے بالمقابل دنیا کی زندگی کو ترجیح دی اس کا ٹھکانا تو بس جہنم ہی بنے گی اور وہ جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرا اور جس نے اپنے نفس کو خواہش کی پیروی سے روکا تو اس کا ٹھکانا لاریب جنت ہے)

ان آیات میں سرکشی نتیجہ ہے اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دینا اس کی علت۔ دوسری طرف رب کے آگے حاضری کا خوف علت ہے اور نفس کو خواہشات سے باز رکھنا اس کا نتیجہ۔ جب دو امور کے مابین یہ نسبتیں معلوم ہو گئیں تو یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں رہا کہ دنیا کو ترجیح دینے والا شخص ایک طرف لازماً سرکشی کی راہ اختیار کرے گا اور دوسری طرف اپنے رب سے بھی بے پرواہو جائے گا۔ اس نتیجہ کی بنیاد یہ ہے کہ ایسا شخص نفس کو خواہشات سے بچا نہیں سکتا۔ اس کے رویہ میں جب یہ اثر پایا جاتا ہے تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس اثر کی علت بھی اس کے ہاں پائی جاتی ہے۔(ر: ۷۰)

و- لفظ اپنے لازم معانی پر بھی مشتمل ہوتا ہے- مثلاً اللہ تعالیٰ کے حکیم ہونے کا لازم یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے درمیان عدل کرے، کوئی چیز بے مقصد پیدا نہ کرے اور کمزور کو کوئی ایسا حکم نہ کرے جو اس کی طاقت سے باہر ہو- جب تم کوئی لفظ پڑھو اور اس کے تمام لازم معانی کو بھی ذہن میں رکھو تو تم پر کلام کا ربط واضح ہو جائے گا- قرآن مجید کی آیت افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا-(محمد ۲۴)(کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں) میں جس غور کا ذکر ہے میرے نزدیک اس سے مراد الفاظ کے لازم معانی ہی پر غور کرنا ہے-

اسی نوعیت کی دوسری چیز وہ لازم مفہوم ہے جو کسی لفظ سے مترتب ہوتا ہو- مثلاً نعمت کے لیے شکر لازم ہے، مالک کے لیے عبادت لازم ہے، ایک قادر مطلق اور نعمت عطا کرنے والے مالک کا لازم حق ہے کہ اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے، اس کا شکر ادا کیا جائے اور اس پر اعتماد و توکل کیا جائے- قرآن مجید میں اکثر دیکھو گے کہ اللہ کی نعمتوں کے ذکر کے بعد شرک کی قباحت بیان ہوتی ہے یا اس کی قدرت کاملہ کے بیان کے بعد شرک کا رد ہوتا ہے تو یہ انہی لازم مفاہیم کی بنیاد پر ہوتا ہے-(ر ۷۰)

ز- جب کلام کے تمام حصوں میں وسیع ربط قائم کرنا ممکن ہو جس کے نتیجہ میں کوئی حصہ ربط سے محروم نہ رہتا ہو تو وہاں ربط کے ایسے پہلو مراد نہیں لینے چاہئیں جو قریب اور متصل حصوں کو تو مربوط کر دیتے ہیں لیکن اس بعید حصہ کو مربوط نہ کرتے ہوں جس کا مضمون پوری طرح چھایا ہوا ہو-

اسی طرح مفہوم کے اس پہلو کو جس کے حق میں عبارت کے اندر کوئی دلیل موجود ہو کسی بھی ایسے پہلو پر ترجیح دی جائے گی جو صرف ایک مفروضہ ہو-

علیٰ ہذا القیاس، مفہوم کا وہ پہلو ترجیح پائے گا جس کی موافقت کتاب و سنت کی محکمات کے ساتھ ہو گی-

اس مضمون کو ہم چند مثالوں سے واضح کرتے ہیں۔

(۱) یایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ و جاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون۔ ان الذین کفروا لو ان لھم ما فی الارض جمیعا و مثلہ معہ لیفتدوا بہ من عذاب یوم القیمۃ ما تقبل منھم ولھم عذاب الیم۔(المائدہ: ۳۵-۳۶)

(اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور اسی کے تقرب کے طالب ہو اور اس کی راہ میں برابر سرگرم کار رہو تاکہ فلاح پاؤ۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ہے اگر انہیں وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اس کے برابر اور بھی تاکہ وہ اس کو فدیہ میں دے کر روز قیامت کے عذاب سے چھوٹ سکیں تو بھی ان کا یہ فدیہ قبول نہ ہوگا۔ان کے لیے بس ایک دردناک عذاب ہی ہے)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ اپنی تفسیر موضح القرآن میں لکھتے ہیں:

"رسول کی اطاعت میں جو نیکی کرو وہ قبول ہے اور بغیر اس کے عقل سے کرو قبول نہیں"۔ یہ کلام اپنی جگہ صحیح ہے لیکن جہاں تک لفظ وسیلہ کے مفہوم کا تعلق ہے اس تفسیر کا یہاں کوئی موقع نہیں۔ عمل کے صالح ہونے کے لیے لازم ہے کہ اس میں پیغمبر کی اطاعت پائی جائے۔ کیونکہ پیغمبر آتا ہی اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو عمل صالح کی طرف دعوت دے اور اس کی وضاحت کرے، اس لیے یہاں دفع دخل مقدر کا کوئی موقع نہیں۔

آیت ما قبل اور مابعد سے موافقت رکھنے والی تفسیر یہ ہے کہ بندے کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے تقویٰ کو ایسے اعمال کے ذریعے ثابت کرے جو اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کرنے والے ہوں۔ مثلاً قربانی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

لن ينال الله لحومها ولا دماء ها ولكن يناله التقوى منكم (حج : ۳۷)

(اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون بلکہ اس کو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے)

سابق آیات میں ہابیل اور قابیل کا قصہ بیان ہوا جس میں قربانی اور تقویٰ کا ذکر تھا۔ اس سے پہلے اللہ کی راہ میں جان کی قربانی دینے اور اس کے ذریعے فلاح پانے کا ذکر تھا۔ یہ ذکر اس ضمن میں ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اللہ کی راہ میں قتال سے انکار کر دیا تھا۔ جان اور مال کی قربانی کا تعلق جہاد اور فدیہ سے بالکل ظاہر ہے۔ لہذا اسی جیاد پر آگے فرمایا کہ جاهدوا في سبيله۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اپنے تقویٰ کا ثبوت جہاد کر کے پیش کرو تو فلاح پاؤ گے۔ قربانی خواہ جان کی ہو یا مال کی، وہ فدیہ ہوتی ہے۔ یہ مفہوم عربوں کے فہم سے بہت قریب تھا۔ چنانچہ ان کے کسی شاعر کا شعر ہے:

؎ نهين النفوس و هون النفوس عند الكريهه ابقى لها

(ہم جانوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ گھمسان کے رن میں جانوں کو معمولی سمجھنا ان کی بقا کا ضامن ہوتا ہے)

فلاح کے مفہوم میں بقا شامل ہے اور فدیہ، قربانی اور اس کے ذریعہ سے برکت کا معنی بھی اس میں شامل ہے۔ لہذا جب فرمایا لعلكم تفلحون (تاکہ تم فلاح پاؤ) تو اس کے بعد یہ وضاحت بھی کر دی کہ قیامت میں فدیہ کے طور پر دنیا بھر کی دولت پیش کی جائے گی تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ لہذا تمہارے لیے لازم ہے کہ دنیا میں صالح اعمال کے ذریعے اپنا فدیہ پیش کرو۔

تم نے دیکھا کہ اس تفسیر کی جیاد وسیع ربط پر ہے، اس کے حق میں عبارت کے اندر شہادتیں موجود ہیں، قرآن کے اندر اس مفہوم کے محکم شواہد پائے جاتے ہیں

اور زبان اس کی تائید کرتی ہے-واللہ اعلم-

(۲) دوسری مثال سورہ انعام میں ہے- فرمایا:

وهذا صراط ربك مستقيما قد فصلنا الايت لقوم يذكرون-

(انعام: ۱۲۶)

(اور یہ تیرے رب کی راہ ہے سیدھی- ہم نے اپنی آیتیں تفصیل سے بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لیے جو یاددہانی حاصل کریں)

اس آیت کی تفسیر شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے یوں کی ہے

"حکم برداری کرنی اور عقل کو دخل نہ دینا سیدھی راہ ہے"-

اس آیت کی یہ تفسیر صحیح نہیں- قرآن مجید میں صراط مستقیم کی وضاحت توحید سے بکثرت کی گئی ہے- یہاں یہ کلام اسلام کو اللہ کے لیے خاص کرنے کے معنی میں آیا ہے اور اس اعتبار سے اللہ کی آیات پر یقین کرنے کی تعلیم دیتا ہے- اس سے متصلاً پہلے یہ آیت آئی ہے۔

فمن يرد الله ان يشرح صدره للاسلام و من يرد ان يضله يجعل صدره ضيقا حرجا كانما يصعد فى السماء كذالك يجعل الله الرجس على الذين لا يومنون-(انعام: ۱۲۵)

(اللہ جس کسی کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے گویا اسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہے- اسی طرح اللہ ناپاکی مسلط کر دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے)

مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو طاعت کی توفیق دیتا ہے تو ان کے سینے اس کے لیے کھول دیتا ہے- چنانچہ وہ اللہ کی آیات سے فائدہ اٹھاتے اور ان کو یاد رکھتے ہیں- رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لانا چاہتے تو ان پر شیاطین کی نجاست پڑ جاتی ہے

جس کے نتیجہ میں ان کے دل حق سے پھر جاتے اور فاسد بد گمانیاں ان کو گمراہ کرتی ہیں- چنانچہ ان کے دل قبول حق کے لیے تنگ ہو جاتے ہیں- تم نے دیکھا کہ یہ نہیں ہو تا کہ مومنین کی عقل معطل ہو جاتی ہو بلکہ یہ ہو تا ہے کہ ان کی عقلیں سلامت روی سے کام کرنے لگتی ہیں- قد فصلنا سے آگے آیت کا آخری حصہ ہمارے اخذ کردہ مفہوم کی تائید میں ہے اور قرآن کی محکمات اسی کی تائید کرتی ہیں-

(۳) الم تعلم ان الله له ملک السماوات والارض یعذب من یشاء و یغفر لمن یشاء والله علی کل شیء قدیر- (مائدہ: ۴۰)

(کیا تمہیں علم نہیں ہے کہ اللہ ہی ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، وہی جس کو چاہے گا سزا دے گا اور جس کو چاہے گا بخشے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ عبدالقادر دہلویؒ فرماتے ہیں:

"یہ اس پر فرمایا کہ کوئی تعجب نہ کرے کہ چور کو تھوڑی خطا پر بڑی سزا فرمائی"-

یہ تفسیر صحیح نہیں- آیت کا سیدھا سادا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک مطلق ہے- وہ ظالموں کو عذاب دیتا ہے اور توبہ کرنے والوں پر رحم فرماتا ہے- جس طرح وہ اپنی قدرت سے عذاب دیتا ہے اسی طرح اپنی قدرت ہی سے معاف کرتا ہے- یہ تفسیر نظم کلام کے مطابق ہے- کیونکہ اس آیت سے قبل چور کی سزا بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ اگر وہ اس گناہ کے بعد توبہ کرے تو اللہ اس کو معاف کرنے والا ہے- اس آیت میں فرمایا کہ جو شخص توبہ کے بعد اصلاح کرلے اس کی مغفرت میں کوئی مانع نہیں اور یہ خدا کی عین مشیت ہے- وہ جو کچھ کرتا ہے اس پر کسی کو انگلی اٹھانے کی اجازت نہیں- چونکہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا کام کرتا ہی نہیں جو ناحق یا خلاف عدل ہو اس لیے چور کی سزا پر اعتراض کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا جس کا جواب یہاں دیا جائے- (ر: ۸۰-۸۲)

زمانہ نزول :

مختلف واقعات کے نظم کے متعدد پہلو ہو سکتے ہیں- نظم کے متلاشی کی ان پر نظر ہونی چاہیے- ان میں سے ایک پہلو ان واقعات کے زمانے کا قرب ہے- مثلاً دعوت کے ابتدائی زمانے کے واقعات اسی پہلو سے منظم ہیں اور ایک دوسرے سے ہٹ کر نہیں آتے- اسی طرح ہجرت کے موقع کے یا اس کے بعد کے واقعات ہیں- پھر مدینہ کی ریاست کے قیام یا فتح مکہ اور اس کے بعد کے زمانہ کے مسائل ہیں- یہ سب معلوم و مشہور اور نمایاں ہیں- اسی زمانی بنیاد پر علمائے سلف نے مکی و مدنی سورتوں کی تقسیم کی ہے یا بعض مکی سورتوں کی آیات کو مدنی اور بعض مدنی سورتوں کی آیات کو مکی کہا ہے- انہوں نے اس سے زیادہ تقسیم نہیں کی- اگر انہی کے اصول پر مزید غور کیا جائے تو ابتدائی دعوت کے امور، ہجرت سے پہلے اور بعد، یا فتح مکہ سے پہلے اور بعد، کے زمانہ کے واقعات بھی پوشیدہ نہیں رہتے- البتہ ایک زیادہ مخفی پہلو پھر بھی باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے مستقبل سے متعلق آیات کا نظم- قرآن مجید میں اس بات کے اشارات موجود ہیں کہ اس امت کو مستقبل میں کیا حالات درپیش ہوں گے اور انہیں کس چیز کی حاجت ہو گی- صحابہ کرامؓ ان اشارات سے واقف تھے اور نبی ﷺ کے بعد پیش آنے والے واقعات میں ان کے مصداق بتایا کرتے تھے- ان اشارات کی نمایاں مثالیں سورہ ھود کی آخری آیات اور سورہ الحجرات میں موجود ہیں- یہ معلوم ہونا چاہیے کہ واقعات جب تک سامنے نہ آ جائیں اس وقت تک اشارات کی حقیقت ظاہر نہیں ہو سکتی- قلب صافی رکھنے والوں کے سوا دوسرے لوگ ان کے پیش آنے پر آیات کی دلالت پر متنبہ ہو پاتے ہیں- قلب صافی رکھنے والے اپنے علم کو پوشیدہ رکھتے ہیں- اگر وہ ایسا نہ کریں تو لوگ ان کو جھٹلانے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ سورہ ھود کی آخری آیات سربستہ راز ہیں- ان کے نظم پر جب تک غور نہ کیا جائے حقائق سے پردہ نہیں اٹھتا- (ر: ۱۰۱-۱۰۲)

موقع کلام:

ایک اور چیز جو فہم نظام میں مدد دیتی ہے وہ موقع کلام کا تعین ہے۔ موقع کے تقاضا کی دلالت ظاہر یا مخفی طور پر خود کلام میں موجود ہوتی ہے۔ مثلاً سورہ اعلیٰ کی آیت ٦ سنقرئک فلا تنسی (ہم تمہیں پڑھائیں گے تو تم نہیں بھولو گے) کے نظم کی طرف میری رہنمائی اس کے موقع پر غور کے بعد ہوئی۔ یہ اس وقت ممکن ہوا جب مجھے تسبیح کے مواقع کی طرف رہنمائی ہوئی۔ نبی ﷺ کو تسبیح کرنے کا حکم ایک تو اس موقع پر دیا جاتا جب آپ اپنی تعلیم کا اثر دیکھتے۔ آپ صحابہ کرام کے احوال پر نظر رکھا کرتے تھے۔ جب ان کو توقع کے مطابق پاتے تو اس پر آپ کے لیے شکر و حمد واجب ہوتی۔ اس کی مثال سورہ نصر میں موجود ہے۔ حسب ذیل آیت کا مضمون بھی یہی ہے۔

وتوکل علی العزیز الحکیم الذی یراك حین تقوم و تقلبک فی الساجدین (الشعراء: ٢١٧-٢١٩)

(اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ رکھو۔ اس خدا پر جو تمہیں دیکھتا ہے اس وقت جب تم اٹھتے ہو اور دیکھتا ہے تمہاری آمدو شد کو سجدہ کرنے والوں کے درمیان)

اسی بنیاد پر آنحضرت ﷺ کو اس وقت بھی تسبیح کا حکم دیا گیا جب آپ صحابہؓ کو نماز پڑھتے اور انفاق کرتے دیکھتے۔ انہیں حضورؐ کی نصیحت سے اپنے اپنے مقدور کے مطابق فائدہ ہوتا اور ان کی کیفیت وہی ہوتی جس کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

کزرع اخرج شطئه فازره فاستغلظ فاستوی علی سوقه یعجب الزراع (الفتح: ٢٩)

(جیسے کھیتی ہو جس نے نکالی اپنی سوئی، پھر اس کو سہارا دیا، پھر وہ سخت ہوئی، پھر وہ اپنے تنا پر کھڑی ہو گئی کسانوں کے دلوں کو موہتی ہوئی)

کبھی نبی ﷺ کو تسبیح اور نماز کا حکم اس موقع پر بھی دیا جاتا جب جھٹلانے والوں کی مخالفت کے

نتیجہ میں آپ کو ملال ہوتا- اس کا مقصد آنحضرتؐ کی تسلی، صبر و ثبات، تسکین اور اپنے موافق لوگوں کی طرف رجوع کرنے کی تلقین ہوتا- متعدد سورتوں میں اس موقع و محل کی آیات آئی ہیں-

سورہ اعلیٰ کے زمانہ نزول میں یہ دونوں حالتیں جمع ہو گئیں- چنانچہ ہمیں اس سورہ میں دو گروہوں کا ذکر ملتا ہے- نبی ﷺ کی طبیعت پر اس چیز کا غلبہ تھا کہ مکذبین سے صرف نظر کر کے تلاوت قرآن اور نماز کے لیے اپنے آپ کو خالص کر لیں- لہذا آپ کو دونوں کام جمع کرنے کا حکم دیا گیا، یعنی یہ کہ شکر ادا کرنے کے لیے تسبیح کریں، اللہ سے مدد طلب کریں اور لوگوں کو نصیحت بھی جاری رکھیں- اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں آپ کو تسلی دی کہ وہی ہادی اور کارساز ہے جو تمہاری دعوت کو مقبول بنائے گا اور تمہارا کام آسان کرے گا، کیونکہ وہی ہے جو مخلوق کو اس کی تقدیر کی طرف لے جاتا ہے- لوگوں میں سے بعض لوگ تمہاری یاد دہانی سے فائدہ اٹھائیں گے اور دوسرے اس سے پہلو تہی کریں گے- پس تم اللہ کے شکر گزار بندے بن کر اپنے کام میں لگے رہو اور مخالفین کی مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی راہ پر چلتے رہو-

فذکر ان نفعت الذکری (اعلیٰ :۹)

(پس تم یاد دہانی کرو اگر یاد دہانی کچھ نفع پہنچائے)

یعنی نہ ان کے پیچھے پڑو اور نہ انھیں بالکل چھوڑ دو کیونکہ یہ اپنے اپنے حالات کے مطابق ہدایت یا محرومی اور فلاح یا بدبختی کی راہ اختیار کریں گے-

اس طرح جب تم آیات کے ایک مجموعے کو غیر مربوط دیکھو گے اور بار بار اس پر غور کرو گے تو رب کے فضل سے کئی حقائق تک رہنمائی پاؤ گے اور بالآخر وہ مجموعۂ آیات ایک تصویر کی طرح ابھر آئے گا- تب اس کا نظام تمام اجزاء سے مطابقت رکھتا ہوا تم دیکھ سکو گے-

(ر :۹۹-۱۰۰)

کلام کے موڑ :

قرآن کا نظام بیشتر واضح ہے لیکن بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں ربط کا پہلو مخفی ہوتا ہے۔یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کلام نے دوسرا رخ اختیار کر لیا ہے۔کلام کا یہ موڑ یا گرہیں نظام کے متلاشی کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ان کو لازماً متعین ہونا چاہیے،ان میں ڈیرے ڈالے جانے چاہئیں اور ان پر کامل تدبر کیا جانا چاہیے۔

نظام پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلے کلام کے یہ موڑ ہی پریشان کرتے ہیں۔جب ان مواقع پر آیات کا ربط واضح ہو جائے تو پوری سورہ کا نظم روشن ہو جاتا ہے۔

نظم صحیح تاویل کی کلید ہے۔مختلف تاویلات کے درمیان یہی فیصلہ کن چیز ہے۔لہذا یہ لازم ہے کہ نظم کے تعین میں کسی سرسری چیز پر قناعت نہ کی جائے۔اللہ تعالیٰ کا کلام ہرگز کمزور نظام کا حامل ہو سکتا اور نہ ہی نظام سے خالی ہو سکتا ہے۔امام رازیؒ نے صحیح کہا ہے کہ قرآن کے لطائف اس کے حسن نظام سے ہاتھ آتے ہیں۔

توضیحی آیات اور تتمے :

یہ بات خود قرآن مجید سے معلوم ہے کہ پورا قرآن ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وقال الذین کفروا لو لا نزل علیه القرآن جملة واحدة کذلک لنثبت به فوادك و رتلنه ترتیلا (الفرقان :٣٢)

(اور کافر کہتے ہیں کہ اس کے اوپر پورا قرآن ایک دفعہ کیوں نہیں اتار دیا گیا۔ہم نے ایسا ہی کیا تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو تدریج و اہتمام کے ساتھ اتارا ہے)

اسی طریقہ پر قرآن موقع موقع کے لحاظ سے نازل ہوتا تھا۔پھر جب کسی حکم کی تخفیف یا اس کی تکمیل کے لیے کوئی آیت نازل ہوتی تو یا تو اس کو سابق حکم کے ساتھ رکھ دیا

جاتا[۲۲] یا پھر باب کے آخر میں تتمہ کے طور پر[۲۳] لیکن چونکہ ابواب[۲۴] کے درمیان فصل صرف رکوع کے ذریعہ سے کیا گیا ہے اس وجہ سے ان تتموں کی مناسبت معلوم کرنے میں لوگوں کو مشکل پیش آتی ہے۔ تاہم مندرجہ ذیل علامتوں سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ تتمہ ہے۔

۱۔ سورہ قیامہ میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ سے وعدہ فرمایا کہ جو باتیں مزید وضاحت کی محتاج ہوں گی اللہ تعالیٰ بعد میں ان کی وضاحت کر دے گا۔ فرمایا:

ثم ان علینا بیانه (پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی وضاحت)

چنانچہ اس وعدہ کے مطابق جب کوئی تشریح و توضیح نازل ہوئی تو اس کے ساتھ اس بات کی تصریح بھی کر دی گئی کہ یہ کلام کسی سابق بات کی توضیح کے طور پر نازل ہوا ہے[۲۵]۔

۲۔ علاوہ ازیں اس قسم کے تتمے جہاں جہاں ہیں ان کا اسلوب ما قبل کے اسلوب سے عموماً مختلف ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تتمہ ہے۔

۳۔ بعض مقامات میں ان کی نوعیت ایسی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کسی سوال مقدر کا جواب دیا گیا ہے یا کسی باریک بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

کلام میں واضح بے ربطی کے مواقع:

جہاں کلام میں واضح بے ربطی نظر آتی ہو تو دیکھنا چاہیے کہ اوپر کے مضمون میں بیان کردہ جامع مضمون کے ساتھ تو آیت کا تعلق نہیں۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ ایک حقیقت جو سابقہ آیات میں بیان ہو چکی دوبارہ بیان کی جاتی ہے کیونکہ اس کو دہرانا کلام کا تقاضا ہوتا ہے۔ ان دونوں مواقع کے درمیان مثال، تفصیل یا کوئی جملہ معترضہ داخل ہوتا ہے جس کے سبب سے کلام میں بے ربطی نظر آتی ہے۔ ان صورتوں میں سابق مضمون کی جامع حقیقت پر نظر رکھنی چاہیے۔

مثال کے طور پر آیت ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا

ربنا انک رؤف الرحیم (حشر:۱۰) (ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کینہ نہ پیدا ہونے دے-اے ہمارے رب، بے شک تو نہایت شفیق و مہربان ہے) کے دو جملوں میں بظاہر بے ربطی ہے-ان کے مضمون پر غور کریں تو ان میں باہمی ربط کے کئی پہلو جمع ہیں-اولاً یہ آیت ایک دعا ہے جو دوسرے اہل ایمان کے لیے حسن نیت کے جذبہ سے پھوٹی ہے-ثانیاً دعا کرنے والا اللہ تعالیٰ کی رافت ورحمت کا سہارا لے کر دعا کرتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ پروردگار اس کو بھی مومنین کے لیے رافت و محبت کا جذبہ عطا کرے-ثالثاً اللہ تعالیٰ کی صفت رافت اہل ایمان کے ساتھ اس کی شفقت کی امید پیدا کرتی ہے-لہذا بندہ اس صفت کے حوالہ سے دعا کرتا ہے کہ پروردگار اس کو اہل ایمان کے ساتھ خیر خواہی کی توفیق عطا فرمائے-اس طرح غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جملوں میں بے ربطی بالکل نہیں ہے-(ر:۸۶)

سورہ اور اس کے اجزائے ترکیبی

نحوی اعتبار سے ایک جملہ کئی اجزائے ترکیبی کا مجموعہ ہوتا ہے اور اس کو مبتدا، خبر، فعل، فاعل، مفعول، حال، تمیز وغیرہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے- منظم کلام چونکہ کچھ جملوں ہی کا مجموعہ ہوتا ہے لہذا اس کے بھی اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں- قرآن مجید کی ہر سورہ ایک منظم کلام پر مشتمل ہے-اس کے اجزائے ترکیبی ہیں عمود، تمہید، نفس مضمون اور خاتمہ-ان کی ضروری وضاحت کی جاتی ہے-(ر:۲۶۲)

ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے:

جاننا چاہیے کہ ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے اور سورتوں کے مطالب میں بے نظمی جو بظاہر نظر آتی ہے، محض قلت تدبر کا نتیجہ ہے-یہ بات ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ قرآن کی سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی-ہر سورہ میں اگر کوئی ایک متعین مقصد نہ ہوتا جس

کے پورا ہونے سے سورہ پوری ہوتی ہو، تو یہ الگ الگ حد بندیوں کی کیا ضرورت تھی- سارے قرآن کو ایک ہی سورہ بنا دیا جاتا؟ نیز جب سورتوں کے لیے کوئی خاص مقدار نہیں ٹھہرائی گئی، بڑی چھوٹی ہر طرح کی سورتیں ہوئیں، تو اگر سورہ کے اندر کوئی نظمی وحدت مدنظر نہیں ہے تو آیتوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کیا ضرورت تھی، اجزاء یوں ہی بکھیر دیے جاتے؟ اور اگر سطر سطر کے برابر اجزاء ہوتے جب بھی کوئی مضائقہ نہ ہوتا-

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آیات کا ایک مجموعہ ایک سورہ کے اندر رکھا گیا اور وہ سورہ کے نام سے موسوم ہوا- گویا ایک شہر بسا کر اس کے اردگرد شہر پناہ کھینچ دی گئی ۲۶- تو اب غور کرنے کی بات ہے کہ ایک ہی شہر پناہ کے اندر کئی شہر کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟ یہ بھی واضح ہے کہ معانی کا تشابہ بھی ان کو ایک شہر پناہ کے اندر نہیں جمع کرتا- معوذتین (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) باہم دگر جس قدر مشابہت رکھتی ہیں معلوم ہے- تاہم ان دونوں کو ایک سورہ نہیں قرار دیا گیا بلکہ دونوں دو مستقل سورتیں قرار پائیں- اسی طرح سورہ تکویر، انشقاق، مرسلات، نازعات، ذاریات، سب ہم معنی سورتیں ہیں لیکن نظم اور اسلوب کلام ان میں مختلف ہیں-

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جب قریش قرآن کے مانند دس سورتیں لانے سے عاجز رہے تو کم از کم ایک سورہ پیش کرنے کے لیے مطالبہ ہوا- اس سے کم کے لیے مطالبہ نہیں ہوا- اور سورتیں چھوٹی بڑی ہر قسم کی مراد ہوئیں لیکن اس سے ایک سورہ کے بقدر کلام مراد نہیں ہوا- ہمارے بعض مفسرین جو اس نکتہ سے واقف نہ تھے بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ قرآن نے اپنے مانند ایک سورہ کے بقدر کلام پیش کرنے کا بھی مطالبہ کیا ہے، ان کو کلام کی اتنی مقدار میں وجہ اعجاز تلاش کرنے میں زحمتیں پیش آئیں- مثلاً آیت حرمت علیکم امھاتکم و بناتکم الایہ (نساء : ۲۳) سورہ کوثر سے مقدار میں زیادہ ہے- لیکن اس سوال میں ان کو حیرانی پیش آئی کہ اس میں اعجاز کا پہلو کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ قرآن نے جو

مطالبہ کیا ہے اس میں پیش نظر ایک سورہ بحیثیت مجموعی ہے- بلاشبہ کسی سورہ کی مثال پیش کرنا تمام جن وبشر کی طاقت سے باہر ہے اگرچہ سورہ کوثر کی سی مختصر سورہ ہی کیوں نہ ہو- اس سے غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ سورہ سے اللہ تعالیٰ کی مراد ایک منظم کلام ہے- اس میں چھوٹی اور بڑی کا امتیاز نہیں ہے- جس طرح درخت، نبات اور حیوان کے الفاظ ہیں جو اپنے تحت کے تمام چھوٹے بڑے اجزاء پر مشتمل ہیں اسی طرح سورہ کا لفظ چھوٹی اور بڑی تمام سورتوں پر مشتمل ہے- بعض علماء کے اقوال سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے- چنانچہ امام سیوطیؒ نے اتقان میں جعبری کا ایک قول نقل کیا ہے :-

"سورہ کی حد قرآن کی اتنی مقدار ہے جو چند آیات پر مشتمل ہو، جن میں تمہید اور خاتمہ ہو اور اس کی کم سے کم مقدار تین آیت ہے"-

اس محقق کے نزدیک سورہ کے لیے ایک ایسی نظمی وحدت ضروری ہے جس میں تمہید، خاتمہ اور عمود ہو اس لیے کم از کم تین آیتیں ایک سورہ کی تالیف کے لیے ضروری ہوئیں-

مزید براں اگر تم چھوٹی سورتوں پر تدبر کرو گے تو معلوم ہو گا کہ ربط نظام کے محاسن کے لحاظ سے وہ بھی بڑی سورتوں کی ہمسر ہیں- چھوٹی سورتوں کے اندر بھی ربط و پیوستگی کی وہ تمام نزاکتیں موجود ہیں جو بڑی سورتوں کے اندر ہیں- اس وجہ سے یہ خیال کرنا کہ چھوٹی سورتوں مثلاً سورہ ماعون، سورہ کوثر اور سورہ عصر وغیرہ میں بے نظمی ہے سخت غلطی ہے- ان سورتوں کا باریک نہج اگر تمہاری سمجھ میں آجائے تو بڑی سورتوں کا نہج سمجھنے میں اس سے تمہیں بڑی مدد ملے گی- اسی طرح بڑی سورتوں کے اندر آیتوں کے ایسے مجموعے ہیں جن کا نظم و ربط بالکل واضح ہے- صرف ایک غبی آدمی ہی ان کے سمجھنے سے قاصر رہ سکتا ہے- مثلاً سورہ بقرہ کی ابتدائی دس آیتیں اپنے نظم کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں- پس جو شخص ان میں تفکر کرتا ہے اس میں آہستہ آہستہ ان سے زیادہ دقیق نظام سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے-

قرآن کے تدبر میں میرا یہی حال ہوا اور میں یقین رکھتا ہوں کہ جو لوگ جستجو کی یہ راہ اختیار کریں گے وہ بالآخر نظم قرآن کو پالیں گے۔ والذین اھتدوا زادھم ھدی (م:۴۹-۵۰)

عمود :

نظام اور وحدانیت رکھنے والے ہر کلام کا ایک عمود ہوتا ہے۔ یہ پورے خطاب کے تمام مطالب کا شیرازہ اور کلام کا مقصود و مطلوب اور حاصل ہوتا ہے۔ عمود کلام کی ترتیب کا جزو نہیں ہوتا بلکہ یہ اس میں روح کی طرح جاری و ساری ہوتا ہے اور کلام کی ایک ایک سطر اسی کی شرح و تفصیل اور دلیل مہیا کرتی ہے۔ اس کو مخفی رکھنا اچھا ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معلوم کرنے کے لیے کلام پر گہرے فکر و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے ٹھیک ٹھیک واقف ہونے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی نظم کلام میں غور کرے، جملوں کے دروبست کو پہچانے اور کلام کے مطالب کا اچھی طرح احاطہ کرے۔ اس غور و فکر کے بعد جو عمود سمجھ میں آئے اس کی روشنی میں دیکھے کہ مزید تفصیل میں جانے کے بعد بھی حسن نظام ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر نظام کے ساتھ یہ مفروضہ عمود ٹھیک بیٹھ جائے تو اسے اختیار کرے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو اسے ترک کر کے دوسرا عمود تلاش کرے۔ (ر:۸۵)

عمود ہمیشہ کلی امور میں سے ہوتا ہے۔ اس کا تعلق وقت یا زمانے کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سورہ میں اگر خاص احکام بیان ہوئے ہوں تو وہ ضمنی طور پر کلی امور کے تحت ہی آتے ہیں[۲۷] بہت کم ایسا ہوا ہے کہ وہ مستقل طور پر آئے ہوں۔ لہٰذا ضروری ہوتا ہے کہ احکام کو ان کے اصول کے ساتھ مربوط کیا جائے۔ باقی رہ گئے خاص واقعات جن کا تذکرہ سورہ میں ہوا ہو تو ان کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کے نزول کا موقع پیدا کیا۔ ان کا ذکر اس لیے آتا ہے کہ وہ سننے والے کی توجہ کو مبذول کرنے کا باعث بنیں۔ عمود کے لیے عظیم الشان بات نہیں بلکہ سب سے زیادہ جامع بات ہونا ضروری ہے کیونکہ وہ سورہ کے تمام مطالب کے لیے

شیرازہ کا کام دیتا ہے۔ ہاں بیان کے لحاظ سے وہ سورہ کے اندر سب سے اہم چیز ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سورہ نور کے اندر آیت "اللہ نور السموات والارض...... الایہ" کو لیجئے یہ کس طرح آفتاب تاباں بن کر چمک رہی ہے لیکن اس کے باوجود وہ سورہ کے اندر عمود کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ایک بالکل ضمنی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ عمود اس کا عورتوں سے متعلق حسن ادب کی تعلیم ہے۔ اسی وجہ سے پیغمبر ﷺ نے حکم دیا ہے کہ یہ سورہ عورتوں کو پڑھائی جائے تاکہ وہ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کو معلوم کر سکیں۔ (م: ۴۷)

عمود ہر سورہ کا ایک ہی ہوتا ہے لیکن یہی ایک بسا اوقات بہت سی چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ مثلاً سورہ حجرات کے عمود کو لو۔ ہے یہ ایک ہی بات، گو لغت میں ہم اس کے لیے ایک ہی جامع لفظ نہ پا سکیں۔ تعبیر مطلب کے لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس سورہ میں بد خلقی پر ملامت اور جھڑکی ہے، عام اس سے کہ وہ بد خلقی خیال سے تعلق رکھتی ہے یا قول سے یا عمل سے۔ چنانچہ اس میں نبی ﷺ کے سامنے گفتگو میں سبقت، آپ کی آواز پر آواز بلند کرنے، عام آدمیوں کی طرح آپ کو پکارنے، بے ضرورت اور بے موقع آپ کو زحمت دینے اور کسی فاسق کی اطلاع پر کسی قوم پر ٹوٹ پڑنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ پھر مسلمانوں کی دو جماعتوں میں اصلاح، ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت اور ان کے درمیان عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے ساتھ تمسخر سے، ان کی عیب جوئی سے، تنابز بالالقاب سے، بدگمانی سے، تجسس سے، غیبت سے، غرور سے، ادعائے پارسائی سے اور پھر سب سے بدترین شے یعنی نبی کریم ﷺ پر اپنے اسلام کا احسان دھرنے سے روکا گیا ہے۔ (م: ۴۷)

عمود کی تلاش ایک مشکل کام ہے:

سورہ کے عمود کی تعیین اگرچہ اس کے نظام کی معرفت کی کنجی ہے، لیکن ہے یہ انتہائی مشکل کام۔ اس کے لیے بڑے تدبر، چھان پھٹک اور آگے پیچھے کی ہم مضمون سورتوں پر اس

وقت تک غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جب تک کہ عمود آفتاب کی مانند چمکنے نہ لگے۔ اس سے سورہ کا ایک ایک گوشہ روشن نہ ہو جائے اور ہر آیت کا موقع و محل اور اس کی راجح تاویل متعین نہ ہو جائے۔ عمود کی تلاش کا یہ کام بوجوہ مشکل ہے، ان میں سے چند اہم وجوہات کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید متشابہ و مثانی نازل ہوا ہے۔ اس میں کئی سورتیں مشابہ مطالب کی حامل ہوتے ہوئے مختلف عمود رکھتی ہیں۔ یا اس کے برعکس ان کے مضامین غیر مشابہ ہیں جبکہ عمود ایک ہی ہے۔ مشابہ سورتوں کے عمود مختلف ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک ہی چیز کو مختلف کلیات کے تحت داخل کرنا ممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ جب تک آدمی ایک سورہ کے مضامین میں بار بار غور کر کے اور ممکن عمودوں میں سے راجح عمود کو متعین نہیں کر لیتا، اس وقت تک اس کی حالت اس مسافر کی ہوتی ہے جو چوراہے پر پہنچ کر بھٹک جائے اور جس راستہ پر جائے اپنی منزل سے دور ہوتا چلا جائے۔

دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا نے قرآن کو جس طرح عقائد و شرائع کے واجبات کی تعلیم کے لیے نازل فرمایا اسی طرح اس کا ایک مقصد تعلیم حکمت بھی رکھا ہے۔ تعلیم حکمت نبی ﷺ کے خاص فرائض میں سے تھی، اسی لیے آپ کو خیر المعلمین بنایا اور وہ آیات عطا فرمائیں جو کمال تعلیم ہیں۔ تعلیم حکمت کا یہ اصول ہے کہ یہ معارف کے بتا دینے سے نہیں بلکہ فکر و عقل کے اس حد تک استعمال سے حاصل ہوتی ہے جس سے آدمی کی پوشیدہ قوتیں ظاہر ہو جائیں۔ چنانچہ جس طرح ہر ترتیب کا اصول ہے قرآن کو ایک پہلو سے ظاہر و واضح بنایا لیکن دوسرے پہلو سے اسے سربستہ راز رکھا۔ اس کے باطن کے بھی کئی درجے ٹھہرا دیے تاکہ لوگ اس کی طرف رہنمائی پائیں۔ اور جو شخص اس میں جتنی محنت کرے اتنا ہی زیادہ وہ اس کے قریب معنی سے بعید معنی کی طرف ترقی کرتا چلا جائے۔ تربیت کے عمل کی تکمیل اس کے بغیر ممکن بھی نہیں ہوتی۔

کلام جب اپنے ظاہر کے لحاظ سے منظم ہوتا ہے تو قاری کو اس کے سمجھنے کے لیے زیادہ غور و فکر نہیں کرنا پڑتا لیکن جب اس کا ربط کہیں واضح ہو اور کہیں مخفی رہ جائے تو قاری کے لیے سوچ بچار لازم ہو جاتا ہے- خدائے علیم و حکیم کے کلام کو پڑھنے والا اس کی طرف بے ربطی کا واضح عیب منسوب کر کے کیسے مطمئن ہو سکتا ہے ؟ پس مامون وہی شخص ہے جو قرآن کے نظام پر یقین رکھتا ہو-

اللہ تعالیٰ نے نظام کو مخفی رکھنے میں بھی درجات کا لحاظ رکھا ہے- اس کا بیشتر حصہ تو حد درجہ مخفی ہے- چونکہ نظام کو سمجھنے کے لیے لوگوں کو غور و فکر پر ابھارنا مقصود تھا اس لیے عمود کو مخفی کر دیا گیا- اگر سورتوں کے عمود واضح کر دیئے جاتے تو ان کے نظام کو سمجھنے کے لیے کچھ زیادہ مشقت نہ اٹھانی پڑتی- اس کے نتیجہ میں کلام غور و فکر کا محتاج نہ ہوتا اور تعلیم حکمت کا مقصد فوت ہو جاتا- اللہ تعالیٰ نے عقلوں کی آزمائش کی خاطر عمود کو مخفی رکھنا تھا اس لیے ضروری ہوا کہ اس تک رسائی مشکل بنادی جائے- لہذا اس کو ثریا کی سی بلندی پر رکھ دیا گیا-

تیسری وجہ عمود کے مشکل ہونے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ مقصد ہی کی خاطر قرآن مجید کو غایت درجہ مختصر بنایا لیکن اس کو حکمتوں سے معمور کر دیا- اس کے عالی مضامین اور گراں قدر مطالب کی بنا پر ایک قاری متحیر ہو جاتا ہے کہ یکساں اہمیت کے حامل کئی مضامین میں سے وہ ایک عمود کا انتخاب کیسے کرے- میں نے کلام اللہ کی ترتیب میں اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے کہ کلام ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کی طرف منتقل ہوتا چلا جاتا ہے اور تمام کا تمام اس لائق ہوتا ہے کہ اس کو سورہ کا مقصد قرار دیا جائے- اس کے بعد ایک مرحلہ آتا ہے کہ کلام اپنے آغاز کی طرف مڑ جاتا ہے- چنانچہ مضامین ایک حلقہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں- اب یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کونسا مضمون عمود کی حیثیت رکھتا ہے- جس طرح بہت سارے عمدہ جواہر ہوں، ان میں سے ہر ایک خوبصورتی میں دوسرے کو مات دے رہا ہو اور آدمی فیصلہ نہ کر پائے کہ ان میں سب سے اچھا کون سا ہے، اس صورت حال

میں یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کس کو ترجیح دے کر ہار کے وسط میں جگہ دی جائے- یہی کیفیت عمود کے متلاشی کی ہوتی ہے-

قرآن کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ ایک پہلو دار ہیرے کی طرح کئی پہلو رکھتا ہے- اس کی شعاعیں اگرچہ مختلف جانب سے نکلتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ رہنمائی ایک ہی راہ کی طرف دیتا ہے- اس کے کلمات سب کے سب سورج ہیں- آدمی کے بس میں نہیں ہوتا کہ وہ ان سب کی شعاعیں ایک نقطہ پر مرتکز کر دے- اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا معاملہ بھی یہی ہے- اس کے تمام فوائد اور خواص کا احاطہ کرنا کسی کے بس میں نہیں- لہذا آدمی کی کوشش کا مقصود یہ ہونا چاہیے کہ وہ عمود کلام کی تلاش میں کمر ہمت کس لے اور جس قدر ممکن ہو اس کے مخفی فوائد کو روشنی میں لائے-

مثال کے طور پر قرآن جب کسی امر کو ثابت کرنا چاہتا ہے تو دیکھو گے کہ اس کے دلائل بکثرت اور مختلف اطراف سے ہوتے ہیں لیکن یہ سب ایک ہی عمود کی طرف رہنمائی کرتے ہیں- اس سے کلام کا نظام گڈمڈ ہو جاتا ہے اور ایسا شخص تو اس کی طرف رہنمائی ہی نہیں پاتا جس نے تدبر نہ کیا ہو یا قرآن کے نظام کے سوا دوسرے کلام کے نظام کا عادی ہو- اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک زمینی چیز کو کرید رہا ہوتا ہے لیکن نگاہ اوپر کی طرف نہیں اٹھاتا کہ آسمانی چیز کو دیکھ سکے- ستارے اس کے سر کے اوپر جگمگ جگمگ کر رہے ہوتے ہیں لیکن وہ سر نیوڑائے ہوئے چل رہا ہوتا ہے- اس کے باوجود ستاروں کی روشنی اس کی راہ کو روشن کرنے کے لیے موجود ہوتی ہے الا یہ کہ وہ اپنی خواہش کے پیچھے اندھا نہ ہو جائے- اس صورت میں اس کی خواہش قرآن کی راہ کے مخالف اور اس کے پیش و عقب کے لیے رکاوٹ بن جاتی ہے- وہ کلمات میں تحریف پر آمادہ کرتی اور اس کے قدم کج کر دیتی ہے- قرآن کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ ایسا آدمی کب پھسلا اور کہاں ہلاک ہوا- اس آدمی کا گناہ اسی کی گردن پر ہوتا ہے- اس طرح اللہ جن کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جن کو چاہتا ہے ہدایت عطا فرماتا

ہے۔ لیکن قرآن سے وہی لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو فاسق اور بد عہد ہوتے ہیں۔ (ر : ۶۸)

سورتوں کی نمایاں آیات کی حیثیت :

ا۔ اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ایک سورہ کی تمام آیات اہمیت کے لحاظ سے بالکل مساوی نہیں ہوتیں۔ بعض آیات کو دیکھو گے کہ اپنے اطراف کی آیات کے درمیان نہایت بلند ہو گئی ہیں۔ یہ چیز کلام کے حسن کے اعتبار سے بہت مناسب اور تعلیم کے پہلو سے نہایت موزوں ہے۔ آیات کی اہمیت کا فرق غور کرنے سے تو واضح ہو ہی جاتا ہے لیکن اس کی صراحت خود نبی ﷺ نے کر دی جب آپ نے بعض آیات کے فضائل بیان فرمائے۔ ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم ان نمایاں آیات پر خاص طور پر غور کریں تاکہ ان کے محاسن و مطالب اور خود ان کی دلالت واضح ہو سکے تاکہ لوگ ان پر سے بہرے اور اندھے بن کر نہ گزر جائیں۔

مثال کے لیے سورہ حدید کو دیکھو۔ اس سورہ کی حسب ذیل آیات کی رفعت و منزلت سے آنکھیں بند کرنا ممکن نہیں۔

ا۔ هو الاول والاخر والظاهر والباطن (آیت ۳)

ب۔ یوم تری المومنون والمومنات یسعی نورهم بین ایدیهم و بایمانهم (آیت ۱۲)

ج۔ الم یان للذین امنوا ان تخشع قلوبهم لذکر الله (آیت ۱۶)

د۔ اعلموا انما الحیوة الدنیا لعب و لهو و زینة و تفاخر (آیت ۲۰)

ھ۔ و انزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (آیت ۲۵)

و۔ و رهبانیة ابتدعوها ما کتبنا ها علیهم (آیت ۲۷)

ز۔ یوتکم کفلین من رحمته (آیت ۲۸)

ح۔ لئلا یعلم اهل الکتب الا یقدرون علی شئی (آیت ۲۹)

اسی طرح کی نادر آیات ہر سورہ میں نظر آتی ہیں لیکن یہ وہ چیز نہیں جس کو ہم عمود سے تعبیر کرتے ہیں- البتہ ان پر غور و فکر بے حد اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور کبھی وہ عمود تک پہنچنے میں بھی مدد دیتا ہے- ان نمایاں آیات کو کسی عنوان کے تحت جمع کرنا بھی مشکل ہے کیونکہ یہ مختلف پہلوؤں سے توجہ مبذول کرتی ہیں- یہ لغت، اعراب، بلاغت، تاریخ، فقہ یا حکمت کے مختلف پہلوؤں سے نمایاں ہوتی ہیں- جس طرح ٹیلے پر جلتی ہوئی آگ کی طرف آدمی متوجہ ہو جاتا ہے اسی طرح ان آیات کی طرف بھی قرآن کا قاری متوجہ ہو جاتا ہے- لہذا ان کی طرف سے غفلت کا کوئی جواز نہیں-

لیکن جب عمود کا تعین کرنے یا نظام کو سمجھنے کے لیے سورہ پر غور کیا جاتا ہے تو اس کے لیے کلمات اور سیاق کلام پر غور لازم ہوتا ہے- اس غور کے نتیجہ میں سورہ کے بعض دوسرے مقامات ابھر آتے ہیں اور دوسرے پہلو سے اس عظیم الشان اور نمایاں آیات کی جگہ لے لیتے ہیں-

۲- چھوٹی بڑی ہر سورہ کے اندر ایسی نمایاں آیات ہیں جو اس کے ساتھ خاص ہیں اور وہ مخفی نہیں رہ سکتیں- سورہ جس قدر چھوٹی ہوتی ہے اس کی یہ صفت اسی قدر بڑی ہو جاتی ہے- اس لیے ان کا معاملہ بے حد اہم ہو جاتا اور اس لائق ہوتا ہے کہ ان آیات کے مواقع کو واضح کرنے کے لیے تفصیل سے بحث ہو تاکہ اس سے یہ بھی واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے چھوٹی سورتوں کو نہایت عظیم حکمت کے تحت مستقل سورتیں بنایا ہے جیسا کہ سورہ العصر، سورہ کوثر اور سورہ اخلاص میں تم دیکھو گے کہ یہ چھوٹی سورتیں بعض پہلوؤں سے بہت بڑی ہیں-

۳- سورہ کی نمایاں آیات اگرچہ فی الجملہ بے حد اہم اور توجہ کو اپنی طرف منعطف کرنے والی ہیں لیکن ان کو بطور عمود اختیار کر کے ان سے ہرگز دھوکہ نہ کھانا چاہیے کیونکہ عمود وہ چیز ہے جو سورہ کو وحدانیت دیتی اور آگے پیچھے کی سورتوں کے ساتھ مناسبت عطا کرتی ہے-

(ر: ۹۳-۹۴)

تمہید :

جہاں تک تمہید کا تعلق ہے کلام کے شروع میں اسے لانے کی ضرورت عموماً اس وقت ہوتی ہے جب اس بات کا امکان ہو کہ مخاطب پر وہ بات مشکل ہو گی- لہٰذا اصل مقصود کے لیے اس کو تیار کرنے کی خاطر تمہیدی بیان پہلے لایا جاتا ہے- اگرچہ تمہید کی بنیادی ضرورت یہی ہے لیکن کلام میں اس سے بے شمار دوسرے پہلو بھی ملحوظ ہوتے ہیں- اس کی مقدار بھی مختلف ہو سکتی ہے اور اس کی خوبیاں بھی ان گنت ہیں- اس میں مرکزی اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ اس میں ان تمام باتوں کو سمو دیا جائے جو سامع کے قلب اور اس کی عقل کو متاثر کرنے والی ہوں تاکہ وہ کلام کے سننے پر آمادہ ہو جائے-

تمہید کو اتنا طول دینا کہ وہ مقصود کلام کے ہم وزن ہو جائے یا اس کے بیشتر حصہ پر چھا جائے پسندیدہ نہیں لیکن ایک ماہر متکلم کلام کے مختلف طریقے اختیار کر سکتا ہے- وہ بات کو اس طریقہ سے پھیر لے جائے گا جس کا اس کے مخاطبوں کو سان گمان بھی نہ ہو گا- کبھی وہ تمہید کو طویل کر کے یا تو اپنا مقصود نہایت مختصر عبارت میں کہہ دے گا یا اس کو بیان ہی نہیں کرے گا بلکہ اس تمہید کو اصل بات کہنے کا ذریعہ بنا لے گا- کبھی وہ تمہید سے اصل مضمون کی طرف اس طرح بتدریج آئے گا کہ تمہید اور مقصود کلام میں کوئی فرق محسوس نہ ہو گا- آغاز کلام میں تمہید کے اسلوب میں اتنا تنوع ہوتا ہے کہ اس کا شمار مشکل ہے- یہ بھی ممکن ہے کہ اگر مخاطب مطیع و منقاد ہے تو قائل تمہید کو ترک ہی کر دے یا اگر قہر و غضب کی حالت میں کوئی حکم دے تو مخاطب پر بجلی کی سی کڑک کے ساتھ ٹوٹ پڑے- ان مواقع کی مثالیں تم سورہ نور یا سورہ توبہ میں دیکھو گے یا پھر ان سورتوں میں جہاں نبی ﷺ سے براہ راست خطاب کیا گیا ہے-

نفس مضمون :

اس حصہ میں مقصود کلام ہوتا ہے جس کو مختلف اطراف سے بیان کر کے ثابت کیا جاتا

ہے۔اس حصہ میں منکرین سے بحث بھی ہو سکتی ہے اور نبی ﷺ اور اہل ایمان سے خطاب بھی ہو سکتا ہے۔بالعموم یہ حصہ ان تمام خطابوں کا جامع ہوتا ہے۔اس کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہوتے ہیں۔

۱۔ تعلیل، یعنی ایسا مضمون جس کا مقصد کسی دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے دلیل فراہم کرنا یا اعتراض اور شبہ کو رفع کرنا ہوتا ہے۔دلیل پیش کرنے کا مقصد کبھی تو غور و فکر کی تربیت ہوتا ہے اور کبھی اس کو ضمناً لایا جاتا ہے تاکہ قاری محض دعویٰ سے بدک نہ جائے۔

۲۔ تفریع، یعنی کسی اصل سے پھوٹنے والی شاخوں کا بیان۔بیشتر احکام و شرائع اس میں داخل ہیں اور مقدمات کی روشنی میں نتیجہ اخذ کرنا بھی اسی کے تحت آتا ہے۔

۳۔ تاصیل، یعنی کسی چیز کی بنیاد اور اصل کا بیان۔احکام و شرائع کی مصلحتیں واضح کرنا یا کسی حقیقت کے اثبات میں برہان کے ذریعے استدلال اس کے تحت آتا ہے۔

۴۔ تفصیل، یہ ایک وسیع باب ہے۔اس کا استعمال مختلف مواقع میں الگ الگ مقاصد سے ہوا ہے۔مثلاً غور و فکر کو کوئی خاص رخ دینا، کسی مشکل مسئلہ کو آسان کر کے سمجھانا، حکمت سے آگاہ کرنا۔کہیں ماسبق کی توسیع یا تحدید مقصود ہوتی ہے یا کسی پیدا ہونے والے سوال کا جواب دینا ہوتا ہے تو تفصیل کے ذریعے ایسا کیا جاتا ہے۔

۵۔ تمثیل، اس کا مقصد کسی مسئلہ کی وضاحت یا اس پر دلیل قائم کرنا ہوتا ہے۔قرآنی قصے، واقعات اور امثال اسی ذیل میں آتی ہیں۔تمثیل کو حکمت کی تعلیم اور اخذ نتائج کا وسیلہ و ذریعہ بنایا گیا ہے۔کبھی اس سے مابعد مضمون کی تمہید اٹھائی جاتی ہے۔

۶۔ مشابہ مضامین ساتھ ساتھ بیان کرنا۔مثلاً شرک کے ساتھ زنا کا ذکر یا توحید کے ساتھ والدین سے حسن سلوک کا ذکر۔اس کا مقصد کسی مضمون کی ماہیت کو کھولنا یا ایک چیز کا صحیح مقام متعین کرنا ہوتا ہے۔

۷۔ مقابل یا ضد مضمون ساتھ ساتھ بیان کرنا۔مثلاً انفاق کے ساتھ ربا کا ذکر۔اس کا

مقصد بھی وہی ہے جو اوپر مشابہ مضامین کے لیے بیان ہوا۔

۸۔ تنبیہ، اس میں مستقبل کے وعدے یا ڈراوے دینا اور کسی فعل کی تحسین یا اس کی قباحت ظاہر کرنا شامل ہے۔ جس طرح دلیل کا مخاطب عقل ہوتی ہے اسی طرح تنبیہ کا مخاطب انسان کا قلب ہوتا ہے جس کو وعدو وعید یا مدح وذم کے ذریعہ سے ابھارا جاتا ہے۔(ر: ۸۴-۸۵)

تعلیم قرآن کے اصولی مسائل :

تعلیم قرآنی کے اصولی مسائل دو حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ عقائد اور اعمال۔ عقائد کے بنیادی مسائل توحید، نبوت اور معاد ہیں (اپنے دلائل کے ساتھ)

توحید کے ساتھ جبر و قدر اور وحدت الوجود کا تعلق ہے پھر توحید اور نبوت کے ساتھ شفاعت کا تعلق ہے۔ معاد کے ساتھ جنت ودوزخ کی حقیقت کے مسائل ہیں۔

اعمال تین قسم کے ہیں۔ شخصی، منزلی اور مدنی۔

اعمال میں نماز ہے اور اسی کے ساتھ حج بھی شامل ہے۔ زکوۃ ہے اور اسی کا جز روزہ ہے۔ مکارم اخلاق ہیں (یہ بر و معروف کے تحت ہیں جس کا ضد منکر ہے) اور پھر شہادت بالحق ہے۔ یہ اگرچہ شخصی اعمال ہیں لیکن ان کا تعلق جماعت سے بھی ہے۔

اس کے بعد عدل و قسط اور اس کے بعد تعاون کا درجہ ہے۔ قسط میں میراث، نکاح اور معاملات شامل ہیں۔ تعاون میں خلافت، سیاست اور جہاد داخل ہیں۔ پھر اعمال کے سرچشمے اخلاق مثلاً محبت، صبر، عزم، تقوی اور عدل میں بھی ہیں۔ ان میں سے بعض چیزیں بہ اعتبار اصول باہم گتھی ہوئی ہیں۔(م ۵۴۰)

خاتمہ :

سورہ کے آخر میں خاتمہ کی آیات آتی ہیں۔ یہ جس طرح کے مضامین پر مشتمل ہوتی اور سورہ کے مضامین سے مربوط ہوتی ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے چند مثالوں پر غور کرو۔

(الف) سورہ ذاریات میں توحید، رسالت اور معاد کی کھلی کھلی دلیلوں کی طرف اشارہ کرنے اور مذکورہ تین چیزوں میں سے اللہ واحد کی طرف دعوت دینے کے بعد خاتمہ کی نو آیات میں کلام نبی ﷺ کو تسلی دینے کی طرف مڑ گیا ہے۔ تسلی کا یہ مضمون اپنے اندر بہت سے پہلو رکھتا ہے۔ یہ قرآن مجید کے نفس مضمون میں بھی اور سورتوں کے خاتمہ میں بھی آیا ہے۔ سورہ ذاریات میں تسلی کے علاوہ مندرجہ ذیل باتیں بھی واضح ہو رہی ہیں :-

۱- ظالموں اور سرکشوں کی باتوں سے درگزر کیا جائے۔

۲- مخالفتوں پر صبر کیا جائے اور حق کے غلبہ کا انتظار کیا جائے۔

۳- اللہ تعالیٰ حکمت، رحمت اور عدل کی صفات سے متصف ہے۔

۴- ظالموں اور سرکشوں کو مہلت دینے میں اللہ کی حکمت ہے۔

۵- اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے مدتیں مقرر کر رکھی ہیں۔

۶- مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے ایک مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور اس مقصد کے اندر ہی ان کی ترقی اور ان کا کمال مضمر ہے۔

۷- ربوبیت اور عبودیت میں نہایت کھلا فرق ہے۔

۸- جزا اور سزا لازمی ہے۔

یہ سارے مطالب اس حسن ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں کہ آپ سے آپ ایک سے دوسرے پر دلیل قائم ہوتی چلی جاتی ہے۔(م :۱۵۴)

(ب) سورہ مرسلات میں آیت ۵۰ **فبای حدیث بعدہ یومنون** خاتمہ کی ایک ہی جامع آیت ہے۔ جس نے ان تمام مضامین کی طرف انگلی اٹھا دی ہے جو از قبیل دلائل و از قسم ترغیب و ترہیب سورہ میں اوپر بیان ہوئے ہیں۔ اس آیت کے استفہامی اسلوب میں متعدد نکتے پوشیدہ ہیں۔ مثلاً :

۱- اس سے اس کلام کی عظمت و منزلت اور تبلیغی اعتبار سے اس کی جامعیت واضح ہوتی ہے۔

۲- مکذبین کے ایمان کی طرف سے ناامیدی مترشح ہوتی ہے-

۳- اس میں ان کے انکار پر ملامت ہے-

۴- آیت کے موقع سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ اتمام حجت کے بعد اب یہ داعی کی طرف سے آخری بات ہے-(م: ۲۴۵-۲۴۶)

(ج) سورہ عبس کی پہلی ۳۷ آیات میں انسان کے فقر و احتیاج اور اس کے کفر و فجور اور استغنا کی برائی بیان کرنے کے بعد آخری پانچ آیات میں دو فریقوں یعنی ارباب خشیت و تقویٰ اور اہل کفر و فجور کے مآل و انجام کے بیان پر سورہ کو ختم کیا ہے- انہی کے بیان سے سورہ شروع بھی ہوئی تھی-(م: ۲۷۸)

سورتوں کے نام اور ان کی ترتیب

سورتوں کے نام:

سورتوں کے نام رکھنے میں چار اصول پیش نظر معلوم ہوتے ہیں:

بعض سورتوں کے نام ان کے ابتدائی الفاظ سے رکھ دیے جاتے ہیں- سیوطیؒ کی تفصیل کے مطابق ایسی سورتیں مندرجہ ذیل ہیں- الحمد، براءة، سبحن، طه، حوامیم، یس، اقتربت، الرحمن، تبارك، سأل، عم، النازعات، ارأیت، تبت- یہود کے ہاں بھی اسی اصول پر صحیفوں کے نام رکھے گئے تھے-

۲- بعض سورتوں کے نام ایسے الفاظ پر رکھ دیے گئے ہیں جو ان سورتوں میں استعمال ہوئے تھے اور نمایاں تھے- مثلاً زخرف، شعرا، حدید، ماعون وغیرہ- یہ الفاظ سورہ کے مقصد کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ سورہ کے اندر بطور ایک نمایاں نشان اور علامت کے ہیں جو اپنے مسمیٰ کو ممتاز کرتے ہیں- اہل عرب اس اصول پر اشخاص اور

اشیاء کے نام رکھتے تھے۔ متلمس اور تابط شرا وغیرہ ناموں میں یہی اصول کار فرما ہے۔

۳۔ بعض سورتوں کے نام ایسے الفاظ سے ہیں جو سورت کے کسی اہم مضمون کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً سورہ نور کا نام آیت نور کی وجہ سے ہے۔ آل عمران، نساء، ابراھیم، یونس وغیرہ بہت سے اسماء اسی طور سے آئے ہیں۔

۴۔ بعض سورتوں کے نام ان کے اس مقصد کے لحاظ سے ہیں جو سورہ میں روح کی طرح جاری و ساری ہے۔ مثلاً سورہ فاتحہ کا نام سورہ صلوٰۃ ہے۔ اسی طرح تین سورتیں برأت، بنی اسرائیل اور محمد سورہ قتال کے نام سے موسوم ہوئیں۔ سورہ اخلاص اور معوذتین بھی اسی ذیل میں شمار ہیں۔

یہ چوتھا اصول نام رکھنے میں سورہ کے اصل مقصد و مفہوم کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اگر ہر سورہ کا نام اسی اصول پر ہوتا تو اہل نظر کے لیے ہر سورہ کا نظام واضح ہو جاتا۔ میں اس میں کوئی قباحت نہیں دیکھتا کہ سورتوں کے ایسے نام بھی رکھے جائیں جو ان کے مقصد کا پتہ دیں بشرطیکہ شریعت اس میں مانع نہ ہو۔ (م: ۵۹-۶۰)

سورتوں کی ترتیب:

۱۔ قرآن کی ترتیب میں جس طرح بعد میں نازل ہونے والی آیات کو پہلے نازل ہونے والی مناسب آیات کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اسی طرح پہلے اور بعد میں نازل ہونے والی سورتوں کو بھی ساتھ ساتھ جگہ دی گئی ہے۔ اس کا سبب ان کی کوئی نہ کوئی مناسبت ہے۔ مثلاً بعد کی سورہ پہلی کی تفصیل کرتی ہے یا مفہوم کے لحاظ سے اس کی موافق ہے یا اس کی تائید کرتی ہے۔ گویا اس صورت میں ایک سورہ مستقل ہوتی ہے اور دوسری اس کی تابع۔ ان دونوں کی حیثیت میں تمیز کرنا بے حد ضروری ہوتا ہے [۲۸]

کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ تابع سورتیں ایک نہیں بلکہ ایک سے زیادہ ہیں۔ کہیں کہیں ایک

سورہ تابع بن کر آتی ہے- پھر ایک اور سورہ اس کی تابع بن کر آئی ہے[49]- ایک تابع سورہ اور اس کے بعد آنے والی مستقل سورہ کے مابین اتصال کا پایا جانا ضروری نہیں-

کہیں یہ کیفیت بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ دو سورتیں ایک پہلو سے مستقل لیکن دوسرے پہلو سے تابع اور متبوع ہو کر آئی ہیں-

ساتھ ساتھ آنے والی دو مستقل سورتوں میں سے پہلی سورہ لازماً پہلے آنے کی زیادہ حقدار ہوتی ہے- سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کی مثال پر غور کرو- یہ دو مستقل سورتیں ہیں- ان میں سورہ بقرہ واقعتہً پہلے آنے کی حق دار ہے- اس میں دعوت ایمان ہے جبکہ آل عمران میں دعوت اسلام ہے- بقرہ میں یہود کے ساتھ بحث ہے جو اقدم ہیں جبکہ آل عمران میں نصاریٰ کے ساتھ بحث ہے- بقرہ ہر لحاظ سے آل عمران سے زیادہ جامع سورہ ہے- ان کے علاوہ مزید کئی اعتبار سے بقرہ کو آل عمران پر فوقیت حاصل ہے-

۲- طویل سورتوں کو طویل سورتوں کے ساتھ اور چھوٹی سورتوں کو چھوٹی سورتوں کے ساتھ جگہ دینا ان کے لمبے یا چھوٹے ہونے کے واحد سبب سے نہیں ہوا بلکہ یہ دوسرے اسباب کے علاوہ صرف ایک سبب ہے- کئی مقامات پر بعد میں آنے والی سورتیں پہلے آنے والی سورتوں سے طویل تر ہیں-

جہاں تک دوسرے اسباب کا تعلق ہے تو آدمی جس طرح مقدار کی مناسبت کو پسند کرتا ہے اسی طرح معانی کی مناسبت کو بھی پسند کرتا ہے- یہ بات بھی ہے کہ چھوٹی سورتوں کو اگر لمبی سورتوں کے درمیان داخل کر دیا جاتا تو وہ گنا جاتیں- ان کا حال وہی ہوتا جو دن کی روشنی میں ستاروں کا ہوتا ہے- آخر نبی ﷺ نے سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کو دو روشن ستارے فرمایا بھی تو ہے- (ر: ۹۵-۹۶)

قرآن مجید کا مجموعی نظام

سورتوں کے مجموعے اور ان میں مکی و مدنی سورتوں کا مقام :

یہ جاننا چاہیے کہ قرآن کی بنیاد وہی ہے جو مکہ میں نازل ہوا- رہا وہ جو مدینہ میں نازل ہوا تو وہ اسی مکی حصہ کے اندر داخل کر دیا گیا اور اس کی حیثیت وہ ہے جو ہار میں وقفہ وقفہ سے آنے والے موتیوں کی ہوتی ہے- سورتوں کے مجموعے پر غور کرو گے تو دیکھو گے کہ ان کے آغاز میں مکی سورتیں ہیں اور خاتمہ پر مدنی- یا کبھی یوں ہوا ہے کہ مکی سورتوں کے ایک مجموعہ کے اندر ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتیں داخل کر دی گئی ہیں- یہ وہی کچھ ہے جو آیات کی ترتیب میں نظر آتا ہے کہ ایک یا ایک سے زیادہ آیتیں سورہ کے آخر میں یا بطور جملہ معترضہ کہیں بیچ میں رکھ دی گئیں- اسی طرح مدنی آیات کو دیکھو گے کہ وہ کسی مکی سورہ کے آخر یا اثنائے کلام میں رکھ دی گئی ہیں- سورتوں کے مجموعہ میں داخل کی جانے والی سورہ کبھی مکی بھی ہوتی ہے جس طرح بیچ میں داخل کی جانے والی آیات مکی ہو سکتی ہیں-

فی الجملہ سورتوں کے کسی مجموعہ میں کتنی سورتیں شامل ہوں، اس کا مدار ان کے مطالب سے استدلال پر ہے- ان مجموعوں میں سورتوں کی تقسیم قرآن کی منزلوں کے مطابق نہیں کیونکہ اس تقسیم میں مقدار کا حوالہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور مطالب کمتر درجہ میں ملحوظ ہیں- پھر ان میں لوگوں کا اختلاف بھی ہے- اس فصل میں ہمارے پیش نظر مطالب پر مبنی تقسیم نہیں ہے بلکہ مقصود مکی سورتوں کے اندر مدنی سورتوں کے مقام کی طرف توجہ دلانا ہے :-

۱-(سورہ ۱ تا ۵) اس مجموعہ میں سورہ فاتحہ مکی ہے- اس کے ساتھ چار مدنی سورتیں مل کر ایک مجموعہ بناتی ہیں- سورہ فاتحہ کی نسبت پورے قرآن کے ساتھ بھی ہے-

۲-(سورہ ۶ تا ۹) سورہ الانعام اور الاعراف دو مکی سورتیں ہیں- ان کے ساتھ دو مدنی

سورتیں الانفال اور البراءۃ ہیں۔

۳۔(سورہ ۱۰ تا ۲۲) سورہ یونس سے سورہ الانبیاء تک بارہ سورتیں تمام کی تمام مکی ہیں۔اس کے بعد سورہ الحج ہے جو میرے نزدیک جہاد، قتال اور ہجرت کے مضامین پر مشتمل ہونے کے باعث مدنی ہے[۱۰۲]۔

۴۔(سورہ ۲۳ تا ۲۴) سورہ المومنون مکی اور سورہ نور مدنی اور شاید داخل کردہ ہے۔

۵۔(سورہ ۲۵ تا ۳۳) سورہ الفرقان سے الم السجدہ تک آٹھ مکی سورتیں اور آخر میں سورہ الاحزاب ایک مدنی سورت ہے۔

۶۔(سورہ ۳۴ تا ۴۹) سورہ سبا سے الاحقاف تک تیرہ سورتیں مکی اور سورہ محمد سے الحجرات تک تین مدنی سورتیں ہیں۔

۷۔(سورہ ۵۰ تا ۶۶) سورہ ق سے الواقعہ تک سات مکی سورتیں ہیں اور الحدید سے التحریم تک دس سورتیں مدنی ہیں۔

۸۔(سورہ ۶۷ تا ۱۱۲) سورہ الملک سے سورہ الاخلاص تک ایک ہی مجموعہ ہے جس میں سورہ المطففین جو مکی سورہ ہے داخل کردہ ہے۔سورہ النصر مدنی سورہ ہے۔سورہ اللہب مکی ہے جو ہجرت کے قریب نازل ہوئی۔

۹۔(سورہ ۱۱۳ تا ۱۱۴) یہ اختتامی مجموعہ ہے جو پورے قرآن کے ساتھ بھی ملا ہوا ہے اور اپنے مجموعہ کی سورتوں کے ساتھ بھی۔اس کی نوعیت سورہ فاتحہ کی سی ہے جس کی نسبت مجموعہ کی سورتوں کے علاوہ پورے قرآن کے ساتھ بھی ہے[۱۰۳]۔(ر:۱۰۳-۱۰۵)

سورتوں کے عمود:

۱۔سورہ الفاتحہ مکی۔یہ ایک جامع دیباچہ کی حیثیت رکھتی ہے۔آگے پورے قرآن میں جتنے مضامین ہیں ان سب کی کلید اس میں ہے۔

۲۔سورہ البقرہ مدنی۔یہ ایمان مطلوب یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت پر ایمان کی وضاحت

کرتی ہے- سورہ میں اس کے دلائل جمع کر دیے ہیں-

۳- سورہ آل عمران مدنی- یہ اسلام، یعنی نبی ﷺ کی اطاعت کی سورہ ہے- یہ پچھلی سورہ سے اس اعتبار سے مماثل ہے کہ اسلام ایمان ہی کا ظاہری پہلو ہے-

۴- سورہ النساء مدنی- یہ سورہ اسلام- آل عمران- کی معاون سورہ ہے- اس میں اس بات کی وضاحت ہے کہ شریعت تمام انسانوں پر ایک رحمت ہے اور یہی حیثیت صاحب شریعت رسول اللہ ﷺ کی ہے-

۵- سورہ المائدہ مدنی- یہ سابق سورہ کی مثیل ہے- اس میں اسلام کی بنیاد عہد الٰہی پر رکھی گئی ہے- پھر اس عہد کے وسطی اور آخری تقاضے بتائے ہیں-

۶- سورہ الانعام مکی- عہد توحید کے حوالہ سے ایسے احکام دیے گئے ہیں جن سے شرک کا ہر دروازہ بند ہو جائے- یہ مضمون سورہ توبہ آیت ۱۱۵ میں بھی بیان ہوا ہے-

۷- سورہ الاعراف مکی- اس سورہ میں رسول کی مخاطب بستیوں والوں کے لیے انذار اور ان کو حق کے غلبہ اور باطل کی شکست کی دھمکی ہے-

۸- سورہ الانفال مدنی- یہ سورہ جہاد کے فرائض کے باب میں ہے- اس میں حق کے قبول عام کی خبر اور تطہیر کا حکم ہے-

۹- سورہ التوبہ مدنی- اس میں حق کے غلبہ کی خبر اور تطہیر کے لیے محنت کا حکم ہے-

سورتوں کا دوسرا مجموعہ سورہ ۱۰ سے سورہ ۲۴ تک ہے- اس کا جامع عمود انذار و تبشیر ہے- زمانی ترتیب کے لحاظ سے اس میں کلام وسط نبوت سے لے کر وسط دور ہجرت تک کا ہے-

۱۰- سورہ یونس مکی- انذار اور تبشیر آخرت کے حوالہ سے- یہ یہود کے تصور کے برعکس ہے جو کمال کے حصول میں ڈھیلے پڑ گئے تو ان کا جھکاؤ زمین ہی کی طرف ہو گیا-

۱۱- سورہ ھود مکی- اس میں اہل مکہ کو عذاب کا خوف دلایا ہے (مثلاً آیت ۱۰۰) مسلمانوں کو صبر

اور کفار سے قطع تعلق کی تلقین ہے جس کا مقصد ہجرت اور نصرت کے لیے تیار کرنا ہے۔ اس میں ثابت کیا ہے کہ شرک اور انکار آخرت عمومی فساد اخلاق اور بالآخر ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کے مرتکب ہلاک ہوتے اور مومنین نصرت پاتے ہیں۔

۱۲۔ سورہ یوسف مکی۔ اس میں قرب ہجرت کی طرف اشارہ اور مایوسی کے بعد حالات میں کشادگی اور حق کے غلبہ کی تمثیل ہے۔

۱۳۔ سورہ الرعد مکی۔ دنیا کا عذاب تنبیہ کے لیے آتا ہے۔ اس کا وقت معین ہے۔ اس میں تاخیر منکرین کو توبہ کا موقع دینے کے لیے کی جاتی ہے۔

۱۴۔ سورہ ابراھیم مکی۔ ہجرت کے بعد مومنین کے لیے فتح اور کفار سے انتقام کی عمومی سنت کا بیان۔

۱۵۔ سورہ الحجر مکی۔ منکرین کے لیے عذاب کا وقت معین ہے لہذا صبر سے کام لو۔

۱۶۔ سورہ النحل مکی۔ اس سورہ کو مدنی بھی بتایا گیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ قبیل ہجرت کی سورہ ہے۔ اس میں قرآن کے منکرین کے اعتراضات کا جواب ہے۔ آیت ۱۰۱ میں تورات کے بعض احکام کو منسوخ کرنے اور آیت ۳۵ میں مشرکین کے ظن پر مبنی اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

۱۷۔ سورہ الاسراء مکی۔ اس میں بھی بشارت اور انذار کا مضمون ہے (آیات ۹، ۱۰) نیز ایسے اعمال صالحہ کا حکم ہے جو فلاح کا باعث ہیں۔ کلام کا رخ یہود کی طرف ہے۔

۱۸۔ سورہ الکہف مکی۔ یہ سورہ بھی انذار و بشارت کی حامل ہے۔ آیت ۵۹ میں وقت موعود تک انتظار کا حکم ہے۔ کلام کا رخ نصاریٰ کی طرف ہے۔

۱۹۔ سورہ مریم مکی۔ اس سورہ میں بشارت، انذار اور انتظار کا مضمون ہے۔ (آیت ۹۷)

۲۰۔ سورہ طہٰ مکی۔ یہ قبیل ہجرت کی سورہ ہے اس میں فیصلہ کے انتظار کا حکم ہے جس کی دلیل سورہ کی آخری آیت ہے۔

۲۱-سورہ انبیاء مکی- قبیل ہجرت میں نازل ہونے والی اس سورہ میں کفار مکہ کے لیے عذاب کے قریب آنے کی خبر دی گئی ہے-

۲۲-سورہ الحج مدنی-(دیکھیے حاشیہ ۳۰) یہ سورہ انبیاء کے ساتھ متصل لیکن ہجرت کے بعد کی ہے-اس میں جہاد اور متقیوں کی ہلاکت کا قانون بیان ہوا ہے-

۲۳-سورہ المومنون مکی-یہ پچھلی سورہ کے ساتھ متصل ہے-اس میں صالحین اہل ایمان کی کامیابی اور مکذبین کی ہلاکت کی خبر ہے-

۲۴-سورہ نور مدنی-یہ پچھلی سورہ کا تمہ ہے-اس میں معاشرہ اور تمدن سے متعلق احکام کی فرمانبرداری کی تعلیم ہے-

۲۵ تا ۳۲- یہ آٹھ سورتیں مکی ہیں-ان میں توحید پر ایمان رکھنے والوں کے لیے اللہ کی نصرت اور کامیابی کا وعدہ ہے-

۳۳-سورہ احزاب مدنی-یہ نبیؐ کے ساتھ معاہدہ اور اس کی تعمیل کے باب میں ہے-احکام کی تعلیم واقعات کے پس منظر میں دی گئی ہے-

۳۴ تا ۴۶ مکی-ان تیرہ سورتوں کا مضمون توحید، قیامت، ضرورت نبوت اور وعدہ نصرت ہے-ان میں دو کا آغاز الحمد للہ سے، تین کا قرآن اور ملائکہ کی قسموں سے اور باقی کا قرآن کے ذکر سے ہوا ہے-آخری سات کے شروع میں حٰمٓ آیا ہے-

۴۷ تا ۴۹ مدنی-ان سورتوں کا موضوع جنگ، فتح اور فتح مند ہونے والوں کو بے لگام ہونے سے روکنا ہے جو ان تینوں میں درجہ بدرجہ بیان ہوا ہے-سورہ محمد سورہ احقاف کے آخر میں بیان ہونے والے مومنین کی نصرت اور فاسقین کی ہلاکت اور رسوائی کے وعدہ کا ایفا ہے-

۵۰ تا ۵۶ مکی-یہ سات سورتیں قیامت کے انذار اور قرآن کے ذریعے تذکیر کے باب میں ہیں-کبھی ایک مضمون کو دوسرے سے نمایاں کر دیا ہے اور کبھی ان کو ایسے ملا دیا ہے کہ وہ دونوں ایک ہی مضمون دکھائی دیتے ہیں-تذکیر کے بعد کفار سے برأت اور اللہ تعالیٰ کی

مشیت پر یقین کا حکم ہے جس کی شکل تسبیح ہے-

۵۷ تا ۶۶ مدنی- یہ دس سورتیں یہود اور ان کے حمایتیوں کے باب میں ہیں- مومنین کو ان کی عادات اپنانے سے روکا ہے- ان سورتوں میں فتح اور غلبہ کا وعدہ ہے لہذا یہ اعلان برأت اور تطہیر کی سورتیں بھی ہیں- آخری سورہ احکام کی سورتوں کے خاتمہ کی سورہ ہے-

۶۷ تا ۷۶ مکی- یہ سورتیں خدا کی بادشاہت کے بارے میں ہیں جس کا تقاضا رسولوں اور تنبیہات کا بھیجا جانا ہے- ان میں نبی ﷺ کو اللہ کے فیصلے کا انتظار کرنے اور اسی پر بھروسہ کرنے کی تلقین ہے-

۷۷ تا ۸۶ مکی- ان سورتوں میں کلام کا رخ خوشحال فاجر مکذبین کی طرف ہو گیا ہے- اور یہ ان کو خوف دلانے کے مضمون کی حامل ہیں- نبی ﷺ کو حکم دیا ہے کہ ان مکذبین کو ابھی مہلت دو کیونکہ اللہ ان کے لیے کافی ہے-

۸۷ تا ۹۶ مکی- ان دس سورتوں میں کلام کا ظاہری رخ نبی ﷺ کی طرف ہو گیا ہے- ہدایت فرمائی ہے کہ اپنے کو اللہ کے ساتھ وابستہ رکھیں- چونکہ فیصلہ کا دن قریب ہے اس لیے خدا کا پیغام محض پہنچا دینے پر اکتفا کریں-

۹۷ تا ۱۰۴ مکی- یہ سورتیں نبی ﷺ کی نبوت کے بلند مرتبہ کو ظاہر کرتی ہیں- کیونکہ اس کا مدار رحمت پر ہے جو اللہ کی بادشاہی کی تعبیر ہے- ان سورتوں میں حرص و آز کے مریض دنیا داروں کو باطل قرار دیا ہے- یہ آگے کی سورتوں کے لیے تمہید کا کام دیتی ہیں جو اس مضمون کی تفصیل کرتی ہیں-

۱۰۵ تا ۱۱۱ مکی- یہ سات سورتیں رسول کے دشمنوں کی بربادی، خود اس کی نصرت اور اہل شوکت کفار پر فتح مندی کا مضمون لیے ہوئے ہیں-

۱۱۲ مکی- یہ سورہ خالص توحید کے مضمون پر مبنی اور خاتمہ قرآن کی مانند ہے- ازلی و ابدی و فطری خدائی دین کا محور و مرجع توحید خالص ہی ہے- یہ سورہ پچھلی سورتوں کے ساتھ اس

پہلو سے جڑی ہوئی ہے کہ توحید، شرک و مشرکین اور یہود سے قطع تعلق کر کے معنوی ہجرت کرنے کا نام ہے- یہ سورہ نصاریٰ پر بے حد بھاری ہے- یہ سورہ فاتحہ کے مماثل ہے- اس کے آغاز میں توحید اور آخر میں یہود و نصاریٰ کی بدعت کا ابطال ہے-

۱۱۳- ۱۱۴ مدنی- یہ سورتیں اللہ تعالیٰ سے استعاذہ پر مشتمل ہیں- ہمیں تلاوت قرآن کے وقت استعاذہ کا حکم ہوا ہے- یہ سورتیں الاخلاص کے لفظ 'الصمد' کے ساتھ مربوط ہیں- صمد کے معنی مرجع اور سہارا کے ہیں[۱۲۷]-(ر: ۱۰۵-۱۱۰)

(ii) نظائر قرآن کی روشنی میں مفہوم کا تعین

نظم کلام کے بعد تفسیر قرآن کا دوسرا اجیادی اصول تاویل قرآن بالقرآن ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن کے ایک مقام کا مفہوم دوسرے مقامات کی مشابہ یا مقابل آیات کی روشنی میں متعین کیا جائے۔ اس اصول کا ذکر علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں یوں کیا ہے :

> "علماء نے کہا ہے کہ جو شخص کتاب عزیز کی تفسیر کرنا چاہے اس کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے قرآن کی تفسیر قرآن سے کرے۔ قرآن میں جو چیز ایک جگہ مجمل ہے وہی چیز دوسری جگہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ ابن جوزیؒ نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں قرآن کے ان مطالب سے بحث کی ہے جو ایک جگہ مجمل ہیں اور دوسری جگہ مفصل۔ میں نے بھی مجمل کے باب میں اس کی بعض مثالوں کی طرف اشارہ کیا ہے"۔ (م-۳۵)

یہ بات قدیم دور سے علماء کہتے آئے ہیں کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے۔ لہذا قرآن ہی کی دوسری آیات کی روشنی میں کی گئی تفسیر سب سے زیادہ قابل اعتماد، واضح اور خوبصورت ہوتی ہے۔ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ امور کا ذکر مختلف عبارتوں میں اس طرح کرتا ہے کہ وہ کہیں مجمل ہوتا ہے اور کہیں مفصل۔ وہ جس مضمون کو ایک جگہ چھوڑ دیتا ہے دوسری جگہ اس کو بیان کر دیتا ہے۔ قرآن نے ایک سے زیادہ مقامات میں اپنی اس خصوصیت کی تصریح کی ہے اور یہ تفسیر کی ایک مضبوط اساس ہے۔ لیکن استعمال اس اساس کا بہت کم ہوا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ معانی پر استدلال کی راہیں محدود نہیں ہیں۔ کبھی ایک آیت کسی ایسے مفہوم کے لیے دلیل فراہم کرتی ہے جو دوسری آیت میں ہوتا ہے اور کبھی دو آیتوں کا جملوں کا ساتھ ساتھ واقع ہونا ایسے مفاہیم کے لیے دلیل مہیا کرتا ہے جو کسی قدر مخفی ہوتے ہیں۔ اگر ہم اس طرح کے استدلال کی راہیں کھول دیں تو مذکورہ اساس کا استعمال

آسان ہو جائے گا۔(ر : ۲۴۲)

ہمارا دعویٰ ہے کہ جس طرح قرآن اپنی آیات کا مفہوم دوسری آیات کے ذریعے کھولتا ہے اسی طرح وہ اپنے مطالب کے نظام اور ان کی مناسبتوں کی طرف بھی اپنے نظائر کے ذریعے رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک مفہوم کے دوسرے مفہوم کے ساتھ ربط پر بکثرت شواہد لاتا ہے اور ان کے ذریعے وہ ان مفاہیم کے درمیان جامع تعلق پر غور کرنے کی راہ کھولتا ہے۔ وہ یہی نہیں کرتا بلکہ اس تعلق پر کئی مثالیں پیش کرتا ہے جن میں سے بعض مثالیں دوسری مثالوں سے واضح تر ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ قاری کو درجہ بدرجہ زیادہ باریک اور گہرے مفاہیم کی طرف لے جاتا ہے۔

اس دعویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی وضاحت کے لیے اسے مثالوں سے کھولا جائے۔ اصول تفسیر کی یہ اساس کلی ہے۔ یہ سب سے بڑی چیز ہے جس پر ہمارا اعتماد ہے۔ البتہ توفیق دینے والا اللہ ہی ہے۔(ر : ۸۳)

تاویل بالقرآن کی مثالیں :

تفسیر قرآن بالقرآن کے اس اصول کی وضاحت ہم متعدد مثالیں دے کر کریں گے۔

۱۔ قوم لوط کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ حجارة من طین (ذاریات : ۳۳) (مٹی کے پتھر) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور دوسری جگہ حجارة من سجیل (ہود : ۸۲)(سنگ گل کے پتھر) آیا ہے جو اول الذکر کی وضاحت کر رہا ہے۔

۲۔ نماز استعانت باللہ کے ہم معنی ہے۔ اس حقیقت تک ہم اس طرح پہنچے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو حکم دیا :

استعینوا باللہ واصبروا (الاعراف : ۱۲۸)

(اللہ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو)

دوسری جگہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا :

استعینوا بالصبر والصلوة (بقرہ : ۴۵)

(مدد چاہو صبر سے اور نماز سے)

۳- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

و سبح بحمد ربک بالعشی والابکار (مومن : ۵۵)

(پس صبح و شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو)

یہ آیت نماز کے بعض اوقات کی تعیین کرنے میں واضح ہے- اس کی تفسیر دوسرے نظائر سے ملتی ہے- چند آیات ملاحظہ ہوں :-

(ا) و سبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل الغروب و من اللیل فسبحه و ادبار السجود- (ق : ۴۰)

(اور طلوع آفتاب سے قبل اور اس کے غروب سے قبل اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہو اور رات کے بعض حصوں میں اور ستاروں کے ڈھل جانے پر بھی اس کی تسبیح کرو)

(ب) فسبح بحمد ربک حین تقوم و من اللیل فسبحه و ادبار النجوم (طور : ۴۹)

(اور جب تم اٹھا کرو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور رات کے بعض حصے میں اور ستاروں کے ڈھل جانے پر بھی اسی کی تسبیح کرو)

(ج) فسبحان الله حین تمسون و حین تصبحون وله الحمد فی السموات والارض و عشیا و حین تظهرون (روم : ۱۸)

(تو جس وقت تم کو شام ہو اور صبح ہو تو اللہ کی تسبیح کرو- آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہے اور شام کے وقت اور جب ظہر ہو)

(د) فاصبر علی ما یقولون و سبح بحمد ربک قبل طلوع

الشمس و قبل غروبها و من انائ اللیل فسبح و اطراف النہار لعلک ترضیٰ (طہ: ۱۳۰)

(پس جو کچھ یہ بکواس کرتے ہیں اس پر صبر کرو اور سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب سے قبل اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور رات کے اوقات میں اور ان کی اطراف کے وقت بھی تسبیح کرو تا کہ تم نہال ہو جاؤ)

(ر) و اقم الصلوۃ طرفی النہار و زلفا من اللیل (ھود: ۱۱۴)

(اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں اور رات کی چند ساعات میں)

(س) اقم الصلوٰۃ لدلوك الشمس الی غسق اللیل و قرآن الفجر۔ (بنی اسرائیل:۷۸)

(سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک نمازیں قائم کرو اور صبح کو قرآن پڑھو)

۴- ایک ذرا گہری مثال یہ ہے کہ فرمایا:

خلق الموت والحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا وھو العزیز الغفور (ملک: ۲)

(اس نے موت اور زندگی پیدا کی تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے اور وہ غالب بخشنے والا ہے)

موت تنبیہ اور نصیحت کرنے والی ایک چیز ہے لیکن زندگی لذتوں سے بھرپور ہے۔ جہاں تک آزمائش کا تعلق ہے وہ موت و حیات دونوں کے ذریعہ ہو رہی ہے۔اگر خواہشات نہ ہوتیں تو لوگ نہ حق سے غافل ہوتے اور نہ اس سے پھرتے۔ اور اگر موت نہ ہوتی تو نہ وہ غفلت سے نکلتے اور نہ موت کے بعد کی زندگی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتے۔ مجھے آیت کی اس تاویل کی طرف پہلے از خود رہنمائی ہوئی، پھر اس کی ایک نظیر بھی میری نگاہ سے گزری۔وہ آیت یہ ہے۔

انا جعلنا ما علی الارض زینة لها لنبلوهم ایهم احسن عملا و انا لجاعلون ما علیها صعیدا جرزا - (کہف : ۸)

(جو چیز زمین پر ہے ہم نے اس کو زمین کے لیے آرائش بنایا ہے تاکہ لوگوں کی آزمائش کریں کہ کون ان میں اچھے عمل کرنے والا ہے - اور جو چیز زمین پر ہے ہم اس کو بنجر میدان کر دیں گے)

اگر غور کرو تو اس آیت کے پہلے حصے میں ذہنی پہلو اور دوسرے میں خارجی پہلو کا ذکر ہے -

۵- قرآن مجید کا ایک عام اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک مسئلہ کے بعض پہلو ایک مقام میں تفصیل سے بیان کر دیتا ہے لیکن دوسرے پہلو مجمل چھوڑ دیتا ہے - یہ مجمل پہلو کسی دوسرے مقام پر بیان ہو جاتے ہیں - ایسے موقعوں پر تفصیل میں پڑے بغیر نفس کلام ہی سے مجمل بات کے معنی سمجھ میں آجاتے ہیں - مثال کے طور پر سورہ انفال کے آخر میں آتا ہے -

ان الذین امنوا و هجروا و جاهدوا باموالهم و انفسهم فی سبیل الله (انفال : ۷۲)

(جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے رہے)

اس سے ذرا آگے یہ آیت آئی ہے -

و الذین امنوا و هجروا و جاهدوا فی سبیل الله (انفال : ۷۴)

(اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کرتے رہے)

یہاں "باموالهم و انفسهم" کے الفاظ نہیں آئے مگر وہ بھی لازماً مراد ہیں - یہاں سے اور آگے چل کر یہ آیت آئی -

والذین امنوا من بعد و هاجروا و جاهدوا معکم (انفال : ۷۵)

(اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور تمھارے ساتھ ہو کر جہاد کرتے رہے)

یہاں نہ فی سبیل اللہ کہہ کر تفصیل کی اور نہ باموالھم و انفسھم کی قید لگائی حالانکہ مفہوم میں یہ دونوں شامل ہیں اور اس پر دلیل معکم (تمھارے ہمراہ) کا لفظ ہے۔

٦- تاویل بالقرآن کا باب ایک وسیع باب ہے اور بڑے معانی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ بقرہ کے شروع میں آیا۔

ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لایؤمنون- ختم اللہ علی قلوبھم و علی سمعھم و علی ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم- (البقرہ :٦-٧)

(جن لوگوں نے کفر کیا انھیں تم ڈراؤ یا نہ ڈراؤ ان کے لیے برابر ہے، وہ ایمان لانے کے نہیں- خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے)

یہاں الذین کفروا کا مفہوم ہم نے یہ سمجھا کہ جنھوں نے اللہ تعالٰی اور اس کی صفات عدل کا انکار کیا اور اس کے نتیجہ میں انھوں نے جزاو سزا کو نہ مانا لایؤمنون سے ہم نے یہ مراد لی کہ وہ لوگ اس کتاب پر ایمان لانے والے اور اس سے راہ یاب ہونے والے نہیں ہیں- اس مفہوم کے لینے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے یہ آیت گزر چکی ہے۔

ذلک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب (بقرہ :٢-٣)

(یہ کتاب ہے جس کے آسمانی ہونے میں کوئی شک نہیں- ہدایت ہے متقیوں کے

لیے جو غیب میں رہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں)

اس سے معلوم ہوا کہ الذین کفروا سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان مومنین بالغیب کی ضد ہوں- اس کے بعد مومنین کی نمایاں خصوصیات کا بیان ہے اور آخر میں آتا ہے-

اولئک علی ھدی من ربھم واولئک ھم المفلحون (بقرہ: ۵)

(یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی نجات پانے والے ہیں)

اس کے بعد ان مومنین کے مخالف گروہ کا ذکر ہوا- یہ تاویل اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مبتدا و خبر میں فرق ہونا ضروری ہے- پھر ہم نے سیاق پر غور کیا تو وہ چیز پالی جو مفہوم کو کھول دیتی ہے- اس کے بعد ہم نے اس آیت کے نظائر تلاش کیے تو ہم نے ان کو اس مفہوم کا مؤید پایا جو ہم نے سمجھا تھا- چنانچہ سورہ یٰسین کے ابتداء میں اور ذیل کی آیات میں ہم نے یہی مضمون پایا-

و اذاقرأت القرآن جعلنا بینک و بین الذین لا یؤمنون بالآخرۃ حجابا مستورا وجعلنا علی قلوبھم اکنۃ ان یفقھوہ و فی اذانھم وقرا و اذاذکرت ربک فی القرآن وحدہ ولوا علی ادبارھم نفورا- (بنی اسرائیل: ۴۵-۴۶)

(اور جب تم قرآن پڑھ کر سناتے ہو تو ہم تم میں اور ان لوگوں میں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے حجاب پر حجاب کر دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا کر دیتے ہیں (تاکہ سن نہ سکیں) اور جب تم قرآن میں اپنے پروردگار یکتا کا ذکر کرتے ہو تو وہ بدک جاتے ہیں اور پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں)

پس قرآن نے ہمیں یہ خبر دے دی کہ جو شخص خدا کے ساتھ شریک ٹھہرائے

اور آخرت کا منکر ہو وہ نہ قرآن کو سنتا ہے اور نہ اسے سمجھتا ہے بلکہ وہ قرآن سے متنفر ہوتا ہے-

قرآن نے معاد پر حکمت تخلیق سے استدلال کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے :

۷- ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنھار لایات لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبھم و یتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار-

(آل عمران : ۱۹۰-۱۹۱)

(بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد و شد میں اہل عقل کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، ان کے لیے جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر خدا کو یاد کرتے رہتے اور آسمانوں اور زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں- ان کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار، تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے- تو اس بات سے پاک ہے (کہ کوئی عبث کام کرے) سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا)

مطلب یہ ہے کہ ایک قادر اور حکیم خداوند سے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایک بے مقصد تخلیق کرے- نیز یہ تخلیق بے مقصد ہو کیسے سکتی ہے جبکہ اس کے اندر اتنے عجائب موجود ہیں- پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اشرف المخلوقات بھی ہو اور اس کا وجود بھی عبث ہو- لہذا یہ لازم ہے کہ جزا اور فیصلے کا ایک دن آئے- ایک سوچنے والا بندہ استدلال میں جب یہاں تک پہنچتا ہے تو پکار اٹھتا ہے- سبحانک، تو پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے- کیونکہ اس کے سامنے رب کی عظمت، جلال، حکمت اور رحمت کی تمام صفات ہوتی ہیں- پھر جب وہ رب کی رحمت کا تقاضا جزا کی صورت میں لازم سمجھتا ہے تو دعا کرتا ہے- فقنا عذاب النار- تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا-

سورہ آل عمران کے اس مقام کی نظیر حسب ذیل ہے۔

اولم ینظروا فی ملکوت السماوات والارض وما خلق اللہ من شئ و ان عسی ان یکون قداقترب اجلھم فبای حدیث بعدہ یومنون۔ (اعراف: ۱۸۵)

(کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کے نظام اور ان چیزوں پر نگاہ نہیں کی جو خدا نے پیدا کی ہیں اور اس بات پر کہ کیا عجب کہ ان کی مدت قریب آگئی ہو تو اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟)

مطلب یہ ہے کہ کیا انہوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی پیدا کی ہے وہ کسی حکمت و غایت کے لیے پیدا کی ہے۔ اسی لیے وہ ایک خاص مدت تک ہی باقی رہتی ہے۔ چنانچہ ہم رات اور دن کا نظام اور موسموں اور عمروں کا عرصہ دیکھتے ہیں۔ اسی طرح ایک قوم ابھرتی اور دوسری رخصت ہو جاتی ہے، جیسا کہ فرمایا بھی ہے:

ولکل امۃ اجل فاذا جاء اجلھم لا یستأخرون ساعۃ ولا یستقدمون (اعراف: ۳۴)

(اور ہر امت کے لیے ایک مقررہ مدت ہے تو جب ان کی مدت پوری ہو جائے گی تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے، نہ آگے بڑھ سکیں گے)

یعنی عین ممکن ہے کہ ان مخاطب مشرکین کی مقررہ مدت قریب آگئی ہو۔ پس تم نے دیکھا کہ آسمان اور زمین کی تخلیق کے مشاہدہ سے معاد کی یاد دہانی کا اشارہ یہاں واضح کر دیا جبکہ سورہ آل عمران کی آیت میں اس کو مخفی رکھا گیا تھا۔

اس مضمون کی ایک اور نظیر سورہ ق میں موجود ہے۔ فرمایا:

بل عجبوا ان جاء ھم منذر منھم فقال الکفرون ھذا شئ

عجیب ، اذا متنا و کنا ترابا ذلک رجع بعید قد علمنا ما تنقص الارض منهم و عندنا کتاب حفیظ بل کذبوا بالحق لما جاء ھم فھم فی امر مریج-(ق :۲-۵)

(بلکہ ان لوگوں کو تعجب ہوا کہ ان کے پاس انہی کے اندر سے ایک آگاہ کرنے والا آیا تو کافروں نے کہا کہ یہ تو ایک نہایت عجیب بات ہے - کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ لوٹائے جائیں گے - یہ لوٹایا جانا تو بہت بعید ہے - ہم نے جان رکھا ہے جو کچھ زمین ان کے اندر سے کم کرتی ہے اور ہمارے پاس ایک محفوظ رکھنے والی کتاب بھی ہے - بلکہ انہوں نے حق کو جھٹلایا ہے جب کہ ان کے پاس آچکا ہے - پس وہ ایک صریح تضاد فکر میں مبتلا ہیں)

مراد یہ ہے کہ ایک شدنی امر کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں - شدنی امر معاد اور جزاو سزا کا نظام ہے - اس کو آگے کی آیات میں واضح کر دیا اور اس کے اثبات کے لیے دلیل بھی دی - فرمایا :

افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنیناھا و زینا ھا و مالھا من فروج والارض مددناھا و القینا فیھا رواسی و انبتنا فیھا من کل زوج بھیج تبصرۃ و ذکری لکل عبد منیب-(ق :۶-۸)

(کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا، کس طرح ہم نے اس کو بنایا اور اس کو سنوارا اور کہیں اس میں کوئی رخنہ نہیں - اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ گاڑ دیے اور اس میں ہر قسم کی خوش منظر چیزیں اگائیں، ہر متوجہ ہونے والے بندے کی بصیرت اور یاددہانی کے لیے)

مراد یہ ہے کہ رب کی قدرت اور حکمت کے یہ مظاہر اپنی تمام خوبیوں اور عظمتوں کے ساتھ ان بندوں کی آنکھیں کھولنے اور دل کو بیدار کرنے کے لیے کافی

ہیں جو صنعت کی مدد سے صانع تک پہنچنے کے لیے تیار رہتے اور اخلاقی پہلو سے اس کی رحمت پر ایمان لاتے ہیں- پھر فرمایا:

و نزلنا من السماء ماء مبارکا فانبتنا به جنات و حب الحصید والنخل باسقات لها طلع نضید رزقا للعباد و احیینا به بلدة میتا کذلک الخروج (ق:۹-۱۱)

(اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا جس سے ہم نے باغ بھی اگائے اور کاٹی جانے والی فصلیں بھی- اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت بھی جن میں تہ بہ تہ خوشے لگتے ہیں، بندوں کی روزی کے لیے- اور ہم نے اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیا- اسی طرح مرنے کے بعد زمین سے نکلنا بھی ہو گا)

دیکھو اس مقام پر آسمان و زمین کے دلائل کی تفصیل کر دی جبکہ پہلے اور دوسرے مقام پر اس کی طرف اشارہ کافی سمجھا گیا تھا- اس کے برعکس ان دلائل پر غور و فکر اور صانع کی طرف جھکاؤ کا اس تیسرے مقام پر جو ذکر کیا ہے اس کی تفصیل پہلے مقام میں آئی ہے-

ملتے جلتے مضامین جب مختلف مقامات پر سامنے آتے ہیں تو عقل ایک شبیہ سے دوسری شبیہ کی طرف منتقل ہوتی ہے اور آدمی اس چیز کا تصور کر لیتا ہے جو ایک موقع پر بیان نہیں ہوا لیکن دوسرے موقع پر بیان ہو جانے کے باعث اس کی یاد میں رہا- قرآن مجید کے قصوں میں اس کی مثالیں بہت ہیں- (ر: ۴۱-۴۳)

تاویل قرآن بالقرآن کے اصول و قواعد:

۱- سب سے پہلے آیت کے مجمل کو واضح کرو اور جو معانی مقدر ہوں ان کو کھولو- یہ کام نظم قرآن کی روشنی میں بہترین تاویل اختیار کرنے سے ممکن ہو گا- یہ چیز دونوں نظیروں کے درمیان مطابقت پر دلیل مہیا کرے گی اور مجمل اور محذوف معانی کو معین کرنے میں دوسری دلیل ٹھہرے گی- کیونکہ قرآن کے عام اسلوب کے مطابق جو چیز

ایک مقام پر مجمل یا محذوف ہوتی ہے وہ دوسرے مقام پر واضح اور ظاہر کر دی جاتی ہے۔

۲۔ جب تم دو مقامات کے کلام میں مطابقت معلوم کر لو تو دونوں جگہ اس کے پچھلے اور اگلے مضمون، یعنی نظم کلام، کو دیکھو۔ کیونکہ ہر کلام کا ایک مناسب نظم ہوتا ہے اور یہ لازم نہیں ہوتا کہ دونوں نظیروں کا نظم ایک ہی ہو۔ کبھی بعض پہلوؤں سے دو مقامات کے نظم میں مشابہت ہو سکتی ہے۔(ر: ۲۶۳-۲۶۵)

۳۔ اگر ایک کلمہ یا جملہ دو تاویلوں کا محتمل ہو اور نظائر بھی دونوں تاویلوں کے حق میں ہوں تو اس صورت میں ایک ہی تاویل مراد نہ لی جائے گی، جب تک دونوں میں وہ راجح تاویل نہ ہو۔ جب راجح تاویل کے نظائر زیادہ ہوں تو نظائر کی کثرت ہی اس کے صحیح ہونے کی دلیل ہو گی۔ ورنہ دونوں تاویلیں مساوی قرار پائیں گی۔ اس اصول کی مثال لفظ قرآن کی تاویل ہے۔ قرآن کے معنی جمع شدہ کے بھی ہیں اور پڑھی جانے والی کے بھی۔ لیکن اول الذکر معنی کے مطابق تاویل صحیح نہ ہو گی کیونکہ جب نظائر کا استقصاء کیا جائے تو مؤخر الذکر مفہوم تمام مواقع پر ٹھیک بیٹھتا ہے بلکہ بعض مقامات پر وہی راجح ہے جب کہ پہلا مفہوم بعض جگہ بالکل مراد نہیں۔

۴۔ جب ایک کلام مختلف تاویلات کا حامل ہو تو ان میں سے جس تاویل کی نظیر قرآن میں ملے گی وہ زیادہ قابل اعتماد ہو گی کیونکہ یہ ممکن ہے کہ جس تاویل کی نظیر قرآن میں نہیں وہ محض رائے اور سراسر گمراہی ہو۔ جس تاویل کی نظیر حدیث میں ملتی ہے اس کو اختیار کرنے سے پہلے اس حدیث کو بھی روایت و درایت کے معیار پر پرکھنا ضروری ہے۔ وہ تاویل جس کی نظیر قرآن میں موجود ہو زیادہ قابل اعتماد ہوتی ہے۔

(iii) کلام میں مخاطب کا صحیح تعین

تفسیر قرآن کی تیسری بنیاد خطاب کا تعین ہے۔ اسی سے خطاب کا صحیح رخ اور اس کا لہجہ متعین ہوتا ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلام کا مضمون تسلی و رافت کا ہے یا زجر و غضب کا، اس کا مقصد وعدہ و وعید ہے یا استدلال و وسعت۔

خطاب کی بحث میں غور کرنے کے پہلو دو ہیں۔ ایک یہ کہ خطاب کس کی طرف سے ہے اور دوسرا یہ کہ خطاب کس سے ہے۔

مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ پورا قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یعنی اس کو اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ پر نازل فرمایا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن میں تمام خطاب بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے مثلاً :

ایاك نعبد و ایاك نستعین (فاتحہ : ۴)

(ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں)

اس میں ظاہر ہے کہ خطاب بندہ کی طرف سے ہے۔ علماء اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ تعلیم فرمائی ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ اس طرح کہو۔ سورہ فاتحہ کے علاوہ بھی قرآن میں ایسی آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دعاؤں کی تعلیم دی ہے۔ مزید برآں اس میں مخلوقات مثلاً کافر و مومن اور انس و ملائکہ کے اقوال کا بیان بھی ہے۔ اگر متکلم کی تصریح ہو گئی ہو تب تو یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ خطاب کس کی طرف سے ہے۔ لیکن جہاں تصریح نہ ہو وہاں موقع کلام اور حسن تاویل سے متکلم کا فیصلہ کرنا کافی غور و فکر کا محتاج ہوتا ہے۔ ایسی جگہوں پر ایک بے خبر آدمی خدا سے وہ باتیں منسوب کر سکتا ہے جو اس کی جلالت شان کے منافی ہیں۔

قرآن میں کچھ کلام ایسا ہے کہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو ہی نہیں سکتی۔ مفسرین اس کو کلام جبریلؑ مانتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورہ مریم میں ہے۔

وما نتنزل الا بامر ربک له ما بین ایدینا و ما خلفنا وما بین ذلک و ما کان ربک نسیا رب السموات والارض و ما بینهما فاعبده واصطبر لعبادته هل تعلم له سمیا-
(مریم۱۹: ۶۵)

(اور ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے- ہمارے آگے اور پیچھے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب اسی کے اختیار میں ہے اور آپ کا رب کسی چیز کو بھولنے والا نہیں ہے- آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک وہی ہے تو اسی کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی پر جمے رہو- کیا تم اس کی کسی اور نظیر سے آشنا ہو؟)

اسی طرح سورہ صافات کے آخر میں ہے:

وما منا الا له مقام معلوم و انا لنحن الصافون و انا لنحن المسبحون (صافات ۳۷: ۱۶۴-۱۶۶)

(اور ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا ایک معین مقام نہ ہو، ہم تو صف بستہ رہنے والے ہیں اور ہم تسبیح کرنے والے ہیں)

جب صورت حال یہ ہے کہ یہ کلام کہنے والے کے ذکر کے بغیر واقع ہوا ہے تو خیال ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے کی آیات کا قائل بھی وہی ہو جو ان آیات کا ہے- معاملہ کی اس صورت میں غور کرنا واجب ہے کہ کون سے کلام میں جبریلؑ کا کلام ہونے کا احتمال ہے، اگرچہ وہ اللہ کا کلام ہونا بھی ممکن ہو-

قرآن میں کچھ کلام ایسا ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف ہو ہی نہیں سکتی- مثلاً:

ذرنی و من خلقت وحیدا (مدثر: ۷۴)

(چھوڑ مجھ کو اور اس کو جس کو میں نے پیدا کیا اکیلا)

یا مثلاً ما ذا اراد اللہ بھذا مثلاً (مدثر :۳۱)

(بھلا اس سے اللہ کی کیا مراد ہے ؟)

جب ہم نزول قرآن کی کیفیت کو بیان کرنے والی آیات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن نام ہے ہر اس چیز کا جو حضرت محمد ﷺ پر ان کے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے - خواہ وہ اللہ کا کلام ہو جو ان کے رب نے ان کی طرف وحی کیا ہے، خواہ وہ جبریلؑ کی عبارت ہو جس کا مفہوم حضرت جبریلؑ پر اللہ تعالیٰ نے وحی کیا ہو، خواہ وہ اللہ کا کلام ہو جسے اللہ نے جبریل کی طرف وحی کیا ہو کہ وہ اسے محمد ﷺ کی طرف وحی کر دیں -

اس کی طرف حسب ذیل آیت ہماری رہنمائی کرتی ہے :

وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنه ما یشاء (شوری ۴۲ :۵۱)

(کسی بشر کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی آڑ سے یا بھیجے کوئی رسول پس وہ وحی کرے اس کے اذن سے جو وہ چاہے)

آخری شکل کا مفہوم یہ ہے کہ فرشتہ اللہ کے اذن سے خود جو وحی کرنا چاہے وہ پیغمبر کو کر دے - اوپر کی مثالوں میں سورہ صافات کی صورت یہی ہے - اس میں فرشتہ اللہ کے رسول اور سفیر کی حیثیت سے کلام کرتا ہے لیکن یہ کلام اس کو بھیجنے والے رب ہی کی جانب سے ہوتا ہے - اس کا رب اس کی زبان پر وہ کلام جاری کر دیتا ہے جو اسے کہنا ہوتا ہے - گویا وہ اپنے رب کی زبان اور اس کے آلہ کار کے طور پر کام کرتا ہے - اذن ہونے کے باعث اس کا کلام رب ہی کا کلام مانا جائے گا - (ر :۱۵۶)

اسی طرح کا سوال مخاطب کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے، یعنی خطاب کن سے

ہے۔چونکہ مخاطب کی تبدیلی سے معانی میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں لہذا ضروری ہے کہ اس کے لیے ایسے اصول دریافت کیے جائیں جو مشکلات میں رہنمائی کر سکیں۔کیونکہ اس معاملہ میں بعض مرتبہ ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں جو آدمی کو شائبہ شرک کے قریب پہنچا دیتی ہیں۔مولانا رومؒ ایک جگہ یہ تک کہہ گزرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نبی کا بندہ بنا دیا ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں کو یآ عبادی الذین اسرفوا الآیہ (اے میرے بندو جنہوں نے زیادتی کی) کے الفاظ سے خطاب کریں۔مولانا رومؒ کے متعلق میرا یہ گمان نہیں ہے کہ انہوں نے فی الحقیقت نبی کو خدا کا شریک بنانا چاہا ہے لیکن بات ان کی زبان سے ایسی نکل گئی ہے جو مشرکین کے اقوال سے مشابہت رکھتی ہے۔اللہ تعالیٰ ان کی اس لغزش کو معاف فرمائے۔اس آیت میں خطاب کی نوعیت بالکل واضح ہے۔ یا عبادی کا خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طرف ہے۔اس کے شروع میں جو قُلْ ہے وہ پیغمبر کو خطاب ہے کہ آپ یہ پیغام حرف بحرف بندوں کو پہنچائیں۔

کسی عام کلام کی توجیہ اس کی خاص جہت خطاب کے اعتبار سے ایک مستقل باب ہے۔ تعیین خطاب کا علم اسی باب کا ایک شعبہ ہے۔جس شخص پر کلام کا صحیح رخ واضح نہیں ہو گا وہ اس کی صحیح تاویل تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔پس یہ باب تاویل اور نظم کلام کے فہم کی کلید ہے اور اس سے بے خبری بہت سی غلطیوں اور ٹھوکروں کا سبب ہو سکتی ہے۔چونکہ مسئلہ خطاب ان بہت سی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے جن میں ہمارے مفسرین مبتلا ہیں لہذا ضروری ہے کہ ہم اس کے اصول متعین کرنے کی کوشش کریں۔

تعیین خطاب کے اصول :

خطاب میں جب مختلف پہلوؤں کا امکان ہو تو اس کو لفظ مشترک کی طرح سمجھنا چاہیے اور اس میں بعض پہلوؤں کا اختیار کرنا اور بعض کو چھوڑنا ناگزیر ہو گا۔جس طرح ایک لفظ مشترک کے تمام معانی کو ہم معلوم کرتے ہیں اور پھر سیاق کلام کی روشنی میں کسی معنی کو

اختیار کرتے اور کسی کو چھوڑتے ہیں، وہی طرز عمل ہمارا اس وقت ہو گا جب کوئی خطاب مختلف پہلوؤں کا احتمال رکھتا ہو- لہذا اولین شے اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہم خطاب کے مختلف پہلو معلوم کریں-

خطاب میں ایک مصدر ہوتا ہے اور ایک منتہٰی-

مصدر یا تو اللہ تعالیٰ ہو گا یا جبریل یا رسول یا لوگ- اسی طرح منتہٰی یا تو اللہ تعالیٰ ہو گا یا رسول یا لوگ- لوگوں میں مسلمان ہوں گے یا منافقین یا اہل کتاب یا ذریت اسمٰعیل یا ان میں سے دو یا تین یا سب- اہل کتاب میں سے یا تو یہود ہوں گے یا نصاریٰ یا دونوں-

یہ پہلو بالکل ظاہر ہیں- اب ان کے اختلاط و التباس کی صورتوں پر غور کرنا چاہیے-

مصدر میں التباس :

مصدر میں التباس اللہ تعالیٰ، رسولؐ اور جبریل کے مابین ہوتا ہے- اگر تم بغیر تنبہ کے قرآن پڑھتے چلے جاؤ تو یہ امتیاز کرنا مشکل ہو گا کہ قائل کون ہے؟ نبی ﷺ اور حضرت جبریلؑ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں- یہ کبھی تو بعینہ مرسل کا قول نقل کر دیتے ہیں اور کبھی وہ بات بطور خود ادا کر دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان پر جاری فرمائی ہے- پھر حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں- یہ کبھی نبی ﷺ سے محض کلام الٰہی کے پہنچانے والے کی حیثیت سے کلام کرتے ہیں اور کبھی آپ کے معلم کی حیثیت سے- اور ان کے معلم ہونے کی حیثیت خود اللہ تعالیٰ نے واضح کر دی ہے-

علمه شديد القوىٰ ذو مرة فاستوى (نجم : ٥-٦)

(اس کو سکھایا نہایت قوت والے طاقتور نے پس وہ سیدھا کھڑا ہوا)

پھر یہ تمام صورتیں ایک دوسرے کے ساتھ ملی جلی ہوئی بغیر کسی امتیاز کے نمایاں ہوتی ہیں اور سیاق کلام کے سوا کوئی اور چیز اس باب میں رہنمائی کرنے والی نہیں ہوتی-

اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ انبیاء کے کلام کی یہ

ایک مشترک خصوصیت معلوم ہوتی ہے- زبور میں بھی اس کی مثال موجود ہے- دیکھو باب ۴۶ آیات ۷-۱۱

"لشکروں کا خداوند ہمارے ساتھ ہے- یعقوب کا خدا ہماری پناہ ہے- آؤ خداوند کے کاموں کو دیکھو خاموش ہو جاؤ اور جان لو کہ میں خدا ہوں- میں قوموں کے درمیان سربلند ہوں گا لشکروں کا خداوند ہمارے ساتھ ہے"-

قاعدہ کلیہ اس باب میں یہ ہے کہ جب کلام صریحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو گا تو اس میں جلال و ہیبت اور قوت و سطوت کا اظہار ہو گا- لہذا اس طرح کا کلام ضرورت کے مواقع پر نمودار ہوتا ہے- مثال کے طور پر سورہ علق شروع سے حضرت جبریلؑ کی زبان سے ہے- لیکن جب غصہ کے اظہار کا موقع آیا ہے تو کلام صراحت کے ساتھ خدا کی طرف سے ہو گیا ہے-

کلا لئن لم ینته لنسفعا بالناصیة (علق : ۱۵)

(کچھ نہیں اگر باز نہ آیا تو ہم چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے) (م : ۶۰-۶۲)

متکلم میں التباس :

قرآن پاک میں کہیں کہیں تو مخاطب کی صراحت کر دی گئی ہے- مثلاً وہ آیات جو یا ایہا الذین امنوا، یا یایہا الناس وغیرہ الفاظ سے شروع ہوتی ہیں یا جو جمع کے صیغہ سے آتی ہیں، اپنے مخاطب کے معاملہ میں صاف ہیں- لیکن کہیں کہیں مخاطب کے تعین میں بھی التباس ہو جاتا ہے- اس کی دو نمایاں شکلیں ہیں جن کی ہم تفصیل کرتے ہیں-

پہلی شکل : جہاں کہیں خطاب واحد سے ہوتا ہے، واضح قرینہ نہ ہونے کی وجہ سے عام مفسرین وہاں نبی ﷺ کو مراد لے لیتے ہیں- حالانکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ خطاب بظاہر تو پیغمبرؐ سے ہے لیکن فی الحقیقت روئے سخن امت کی طرف ہوتا ہے- پیغمبر چونکہ امت کا وکیل اور امام ہونے کی حیثیت سے ان کی زبان اور ان کا کان ہوتا ہے، اس لیے مخاطب اسی کو کیا جاتا ہے- توریت میں اس کی مثالیں بہت ہیں کہ مخاطب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بصیغہ

واحد کیا گیا ہے لیکن اس سے مراد ان کی امت ہے۔ قرآن مجید میں اس طرح کے مواقع پر نظم وسیاق کی رہنمائی سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب کون ہے؟ چند مثالوں پر غور کرو۔

۱- سورہ انعام کی آیت ۶۶ میں فرمایا:

و کذب به قومک وھوالحق قل لست علیکم بوکیل لکل نبا مستقر فسوف تعلمون-

(اور اس کو تمہاری قوم نے جھٹلایا حالانکہ وہ سراسر حق ہے۔ کہہ دو کہ میں تمہارا داروغہ نہیں ہوں۔ ہر خبر کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم کو عنقریب معلوم ہو جائے گا)

یہاں مخاطب واحد کے صیغہ سے ہے جس سے مراد نبی ﷺ ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہی دوسری آیت میں واحد کے صیغہ سے ہی خطاب کیا مگر اس سے مراد امت لی۔ فرمایا:

واذا رایت الذین یخوضون فی ایاتنا فاعرض عنھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ و اما ینسینک الشیطان فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظالمین- (انعام: ۶۸)

(اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کے بارے میں باتیں بنا رہے ہیں تو ان سے الگ ہو جاؤ یہاں تک کہ وہ اور باتوں میں مصروف ہو جائیں اور اگر یہ بات شیطان تمہیں بھلا دے تو یاد آنے پر ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو)

یعنی تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی آیات کے ذریعہ نصیحت کرو لیکن جب وہ باتیں بنانے لگیں تو ان سے اعراض کرو۔ گویا یہاں دو چیزوں کا حکم دیا۔ ایک نصیحت دوسرے اعراض۔ پھر اس کو کھول بھی دیا۔ فرمایا:

وما علی الذین یتقون من حسابھم من شیء ولکن ذکری لعلھم یتقون-(انعام: ۶۹)

(اور پرہیزگاروں پر ان لوگوں کے حساب کی کچھ بھی ذمہ داری نہیں، البتہ نصیحت کی ذمہ داری ہے تاکہ وہ بھی پرہیزگار ہوں)

یعنی ظالمین کے حساب کی ذمہ داری مومنین پر نہ ہوگی- البتہ وہ نصیحت کے جوابدہ ہوں گے- نصیحت کے بعد اگر کوئی قوم کفر کی روش پر چلے گی تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے اس کا محاسبہ نہیں کرے گا- وہ ان کی بدعملیوں سے بری الذمہ قرار دیئے جائیں گے-

سورہ نساء کی آیت ۱۴۰ اسی مضمون کو پیش کرتی ہے- وہاں فرمایا:

و قد نزل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم ایات اللہ یکفر بھا و یستھزء بھا فلا تقعدوا معھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ انکم اذا مثلھم-

(اور خدا نے تم پر اپنی کتاب میں یہ حکم نازل فرمایا ہے کہ جب تم سنو کہ خدا کی آیتوں کا انکار ہو رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو جب تک وہ لوگ اور باتیں نہ کرنے لگیں ان کے پاس مت بیٹھو ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے)

یہ آیت سورہ انعام کی اسی آیت کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کو ہم نے اوپر بیان کیا ہے- اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں اس کے سوا اور کوئی آیت اس مضمون کی نہیں آئی- اسی سبب سے بعض مفسرین مثلاً ابن جریر کو یہ گمان بھی ہوا کہ اس آیت نے سورہ انعام والی آیت کو منسوخ کر دیا ہے، حالانکہ یہاں نسخ کے ماننے کی ضرورت نہیں- اس آیت میں کفار کی مجلسوں میں اس وقت بیٹھے رہنے سے منع کیا ہے جب کہ وہ اسلام کا استہزاء کر رہے ہوں- یہی مضمون سورہ انعام والی آیت میں بھی ہے-

۲- اس خطاب کی دوسری مثال سورہ ہود میں ہے- فرمایا:

فاستقم کما امرت و من تاب معک ولا تطغوا انہ بما تعملون بصیر- ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم

النار و مالکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون- واقم الصلوۃ طرفی النہار وزلفا من اللیل ان الحسنات یذھبن السیات ذلک ذکری للذاکرین- (ھود : ۱۱۲-۱۱۴)

(پس قائم رہو تم اور جو لوگ تمہارے ساتھ تائب ہوئے ہیں، جیسا تم کو حکم دیا جاتا ہے- اور حد سے تجاوز نہ کرنا- بیشک وہ تمہارے سب اعمال کو دیکھ رہا ہے- اور جو لوگ ظالم ہیں ان کی طرف مائل نہ ہونا ورنہ تمہیں دوزخ کی آگ آ لپٹے گی اور خدا کے سوا تمہارے کوئی دوست نہ ہوں گے، پھر تمہیں کہیں سے مدد نہ مل سکے گی- اور دن کے دونوں سروں اور رات کی چند ساعات میں نماز پڑھا کرو- بیشک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں- نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے یہ نصیحت ہے)

یہاں **لا تطغوا** سے آگے خطاب دراصل نبیؐ کے واسطہ سے عام لوگوں سے اور امت سے ہے-

۳- سورہ توبہ کی ایک آیت ہے :

ان تصبک حسنۃ تسؤھم و ان تصبک مصیبۃ یقولوا قد اخذنا امرنا من قبل (توبہ : ۵۰)

(اگر تم کو بھلائی پہنچتی ہے تو ان کو تکلیف ہوتی ہے اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں خوب ہوا، ہم نے اپنا بچاؤ پہلے ہی کر لیا)

یہاں خطاب واحد کا ہے لیکن مراد اس سے عام مومنین ہیں- چنانچہ اس کے جواب سے اس کی وضاحت ہو گئی ہے-

قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ھو مولانا و علی اللہ فلیتوکل المؤمنون- (توبہ : ۵۱)

(کہہ دو نہیں پہنچے گی ہم کو کوئی مصیبت مگر جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے-
وہ ہمارا مولا ہے اور چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں اہل ایمان)

دوسری شکل : خطاب کی دوسری شکل یہ ہے کہ خطاب تو واحد ہی ہوتا ہے مگر دراصل اس کا رخ نبی ﷺ کے واسطہ کے بغیر ہی لوگوں سے ہوتا ہے- یہ خطاب کبھی کبھی نبی ﷺ سے خطاب سے قبل یا اس کے بعد التفات کے طریقہ سے بھی آتا ہے- جو لوگ زیادہ غور و فکر نہ کریں اور حسن تاویل کی کوشش نہ کریں، وہ ایسے مواقع پر بات کو گڈمڈ کر دیتے ہیں اور ضمائر کے انتشار سے بچنا چاہتے ہیں- حالانکہ یہ موقع التفات کا ہوتا ہے- یہاں ضمیر کے مرجع کی تبدیلی پائی جائے تو کوئی حرج واقع نہیں ہوتا-

اس طرح کے خطاب کی مثالیں قرآن مجید میں بے شمار ہیں، ہم چند ایک مثالیں یہاں پیش کریں گے- فرمایا :

۱- و قضی ربک الا تعبدوا الا ایاه وبالوالدین احسانا اما یبلغن عندك الکبر احدهما او کلاهما فلا تقل لهما اف ولا تنهرهما و قل لهما قولا کریما- (بنی اسرائیل :۲۳)

(اور تمہارے رب نے فیصلہ کر دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کرو- اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ ان کو اف کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے ادب کی بات کہنا)

اس آیت میں واحد سے جمع اور جمع سے واحد کی طرف منتقل ہونے کی ایک سے زیادہ مثالیں موجود ہیں- لیکن مراد یہاں عموم ہی ہے- یہاں پر ایسے قرینے بھی موجود ہیں کہ کسی طرح پیغمبر ﷺ کی طرف خطاب کا گمان نہیں کیا جا سکتا- ایک معمولی علم کا آدمی بھی جانتا ہے کہ نبی ﷺ کے والدین زندہ نہ تھے کہ آپ کو اس آیت کے ذریعہ ان کے ساتھ احسان کا

حکم دیا جاتا۔

۲-الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل (فیل :۱)

(کیا تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟)

یہاں خطاب واحد کے صیغہ سے ہے لیکن مراد عام ہے۔اس بات کا صاف قرینہ موجود ہے کہ نبی ﷺ کے بجائے وہی لوگ اس کے مخاطب ہوں جنہوں نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا تھا۔یا اس کو بطریق تواتر سن کر اس پر یقین رکھتے تھے۔

البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ خطاب کے عموم پر دلالت کرنے کے لیے کوئی دلیل قاطع آیت میں موجود ہو۔یہ حقیقت اسلوب کلام اور حسن تاویل کی معرفت سے بھی معلوم ہو سکتی ہے۔مثال کے طور پر ذیل کی آیات دیکھئے۔فرمایا :

۱- فمالکم فی المنافقین فئتین واللہ ارکسھم بما کسبوا اتریدون ان تھدوا من اضل اللہ و من یضلل اللہ فلن تجد لہ سبیلا۔ (نساء :۸۸)

(تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو رہے ہو حالانکہ خدا نے ان کو ان کے کرتوتوں کے سبب اوندھا کر دیا ہے۔کیا تم چاہتے ہو کہ جس شخص کو خدا نے گمراہ کر دیا ہے اس کو رستے پر لاؤ۔اور جس شخص کو خدا گمراہ کر دے تو اس کے لیے کبھی بھی رستہ نہیں پاؤ گے)

یہاں ابتدا میں کلام جمع کے صیغہ سے شروع ہوا لیکن لن تجدلہ میں واحد کی ضمیر آگئی جس سے مراد عام خطاب ہی ہے۔

۲-الم تر ان الفلک تجری فی البحر بنعمۃ اللہ لیریکم من ایاتہ (لقمان :۳۱)

(نہیں دیکھتے کہ کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں اللہ کے فضل سے تاکہ وہ تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے)

اس آیت میں کلام واحد کے صیغہ (الم تر) سے شروع ہوا لیکن پھر لیریکم میں جمع کی ضمیر آگئی ہے کیونکہ واحد سے مقصود در حقیقت جمع ہی ہے۔

۳-الم تر ان الله خلق السموات والارض بالحق ان يشأ يذهبكم و يأت بخلق جديد (ابراہیم :۱۹)

(نہیں دیکھتے کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو ایک مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں فنا کر دے اور تمہاری جگہ نئی مخلوق بسائے)

اس آیت میں بھی وہی اصول ملحوظ ہے۔

۴- يايها الذين امنوا لا تقولوا راعنا و قولوا انظرنا واسمعوا و للكفرين عذاب اليم- ما ننسخ من آية او ننسها نات بخير منها او مثلها الم تعلم ان الله على كل شی ء قدير- الم تعلم ان الله له ملك السموات والارض ومالكم من دون الله من ولی ولا نصير- (بقرہ :۱۰۴-۱۰۷)

(اے ایمان والو، راعنا مت کہو بلکہ انظرنا کہو اور غور سے سنو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ہم جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں یا اسے نظر انداز کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت اس کی جگہ لاتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔ اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی حمایتی ہے اور نہ کوئی مددگار)

دیکھو خطاب جمع کے صیغہ لاتقولوا سے شروع ہوا- پھر الم تعلم کا واحد صیغہ آگیا اور اس کے بعد و مالکم میں پھر جمع کی ضمیر آگئی- کیونکہ الم تعلم میں خطاب دراصل عام ہی تھا-

۵- سورہ حاقہ کی آیت ۷

فتری القوم فیہا صرعی

(تو تو لوگوں کو اس میں پچھاڑے ہوئے پڑے دیکھتا)

میں خطاب عام ہے- گویا مطلب یوں ہے کہ اے مخاطب! اگر تو وہاں ہوتا تو یہ دیکھتا-

۶- فما یکذبک بعد بالدین- الیس اللہ باحکم الحاکمین- (التین ۷-۸)

(سو اب کیا ہے جس سے تو جزا کو جھٹلاتا ہے، کیا خدا سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں؟)

میں بھی خطاب نبی ﷺ سے نہیں بلکہ مخاطب سے ہے- اہل تاویل نے اس آیت میں خطاب کی تعیین میں سخت غلطی کی ہے-

۷- آیات

فبای الآء ربک تتماری

(تو اپنے رب کے کون کون سے کرشموں میں شک کرے گا؟)

مآادرک ماالقارعہ (اور تو نے اس ٹھوکنے والی کو کیا سمجھا؟)

وغیرہ میں بھی عام خطاب ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے-

الغرض جب قرآن نے عام انسانوں یا مخاطب جماعت کو حسب موقع واحد، جمع، مثنیٰ کے صیغوں سے اکثر مخاطب کیا ہے تو تعیین خطاب میں اصول کی حیثیت سے حسن تاویل کو پیش نظر رکھنا چاہیے- (ر: ۱۶۱-۱۶۵ا)

(iv) الفاظ کے شاذ معانی کا ترک

تفسیر قرآن کا چوتھا بنیادی اصول یہ ہے کہ قرآن مجید کے کسی لفظ کے ایسے معنی مراد نہیں لیے جائیں گے جو لغت میں شاذ ہوں اور باقی قرآن سے موافقت نہ رکھتے ہوں۔ ہم اس اصول کو محض مرجح اصول نہیں سمجھتے کیونکہ بسا اوقات کسی عام ظاہر لفظ کے بجائے کلام میں کوئی اچھا محفوظ لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے لیکن جب بھی ایسا لفظ استعمال ہوتا ہے لازم ہے کہ وہ اپنے معلوم و ثابت مفہوم ہی پر دلالت کرے۔ اگر اس لفظ سے مراد کوئی ایسا مفہوم لیا جائے جس سے عام لوگ واقف نہ ہوں اور ایک مدعی محض اس کا دعویٰ ہی کرتا ہو، اس کے پاس اس کے ثابت کرنے کی کوئی دلیل نہ ہو، تو یہ ایک معمابازی ہو گی۔ حالانکہ قرآن مجید کو خدا نے عربی مبین میں نازل فرمایا ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو وہ اس میں فصاحت کو کیوں ملحوظ نہ رکھے گا؟ جہاں تک قرآن مجید کے عالی مطالب کا تعلق ہے وہ اس ذیل میں نہیں آتے کیونکہ ان کا کلام اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہوتا ہے اور وہ عالی مضامین انہی الفاظ میں مضمر ہوتے ہیں جن میں کوئی تضاد و تناقض نہیں ہوتا۔

اس اصول کی وضاحت کے لیے ذیل کی مثالوں پر غور کرو۔

۱۔ سورہ تحریم کی آیت ۴ ہے:

فان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما

(پس اگر تم دونوں خدا کی طرف رجوع کرو تو یہ اقرب ہے کیونکہ تمہارے دل تو مائل ہی ہو چکے ہیں)

یہاں صغو کے معنی میل الی الشئ (جھکنا) کے ہیں لیکن باطل پسندوں نے اس کے معنی پھیر کر زیغ (گمراہ ہونا) کا مفہوم لینے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح انہوں

نے ازواج مطہرات کو مطعون کیا۔ انہوں نے اپنی اس باطل تاویل کے لیے ایک جھوٹی قرأت بھی وضع کی مگر اسے تواتر کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔

۲۔ سورہ آل عمران کی آیت ۱۶۰

لقدمن الله على المومنين اذبعث فيهم رسولا من انفسهم

(اللہ نے مومنوں پر احسان فرمایا جب ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا)

کے تحت کسی کا قول یہ ہے کہ انفسھم میں فاء منصوب ہے۔ یہ تاویل بالکل باطل ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلا :

اولاً یہ معنی شاذ ہیں۔ خود قرآن میں یہ بات موجود ہے کہ نبی ﷺ اپنی قوم میں سے تھے۔

ثانیاً یہ کہ بالکل واضح معاملہ ہے۔

ثالثاً یہ کہ رسول کا اپنی قوم میں سے ہونا کوئی عیب نہیں۔ وہ انہی میں سے ہوتا ہے۔

رابعاً یہ کہ کلام عرب کے نظائر اس تاویل کے خلاف ہیں۔ عرب اس مفہوم کے لیے من خیارھم اور من علیائھم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ من انفسھم نہیں کہتے۔

خامساً یہ کہ خدا کا احسان اسی شکل میں زیادہ ہوتا ہے جب رسول اپنی قوم ہی میں سے مبعوث ہو۔

سادساً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ اسی قوم کے ایک فرد کو نبوت پر سرفراز کرے۔

جن لوگوں نے یہ غلط تاویل اختیار کی وہ دراصل اس کو آیت مباہلہ کی ایک غلط تاویل کے لیے سند کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔

۳۔ سورہ طلاق کی آیت ۱۰، ۱۱ کے الفاظ

قد انزل الله اليكم ذكرا رسولا

(خدا نے تمہاری طرف اپنا ذکر نازل فرمایا یعنی رسول) کی تاویل میں اشاعرہ،
شیعہ اور بعض اہل حدیث نے ذکر کا مفہوم متعین کرنے میں خطا کی۔

۴- اہل حدیث نے حدیث کی تعظیم کے نقطہ نظر سے الحکمۃ کے معنی حدیث کے کر دیے۔

۵- ثعلب کا ایک قول ہے کہ آیت

فالیوم ننجیک ببدنک (آج ہم تیرے بدن کو بچالیں گے)

میں ببدنک سے مراد بدرعک (تیری زرہ کو) ہے۔ لوگوں کو فرعون کے غرق ہونے میں شک ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم دیا کہ فرعون کی زرہ کو کسی ٹیلے پر پھینک دے۔ جب سمندر نے اس حکم کی تعمیل کی تو لوگوں کو فرعون کے غرق ہونے کا یقین آگیا۔ اخفش کا قول ہے کہ جو شخص ببدنک سے بدرعک مراد لیتا ہے اس کے اس قول کی کوئی بنیاد نہیں۔ کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب تک کوئی قرینہ موجود نہ ہو بدن کے لفظ سے ذہن زرہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔

آیت زیر بحث میں ایسا مفہوم لینے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔ پھر دوسرا پہلو یہ ہے کہ آدمی اپنے جسم اور شکل سے پہچانا جاتا ہے نہ کہ زرہ سے۔ اسی لیے اس آیت سے آگے ارشاد ہے :

فتکون لمن خلفک آیۃ (تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی ہو)

(ر : ۲۶۳،۲۷۴)

ب- ترجیح کے اصول

تفسیر قرآن کے مذکورہ بالا چار بنیادی اصول ان مقامات کی تفسیر کے لیے استعمال ہوتے ہیں جہاں زیادہ معانی پیدا ہونے کا احتمال نہ ہو لیکن قرآن مجید کے بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں پر کلام مختلف معانی کا محتمل قرار دیا جاسکتا ہے- ایسے مواقع پر راجح و مرجوح تاویلات معلوم کرنے کے بھی چند اصول ہیں جنہیں "اصول مرجحہ" کا نام دیا جاسکتا ہے- ان کی روشنی میں ہم صرف راجح معنی کو اختیار کریں گے اور مرجوح معنی کو ترک کر دیں گے-

ترجیح تاویل کے یہ اصول پانچ ہیں-

پہلا اصول :

یہ جاننا چاہیے کہ ہر کلمہ کے مختلف پہلو ہوتے ہیں جن کی حیثیت اس کلمہ کے معانی کی ہوتی ہے- اسی طرح ہر معاملہ اور ہر قصہ کئی اعتبارات سے پیش کیا جاسکتا ہے- اب جیسا کہ ایک مشترک لفظ کا مفہوم موقع و محل کے لحاظ سے متعین کیا جاتا ہے اسی طرح لازم ہے کہ الفاظ و معاملات کی بھی ان کے محل کے مطابق تاویل کی جائے-

مثال کے طور پر خدا کی مخصوص صفت اس کی کامل احدیت ہے لیکن اس کے باوجود ہم مختلف مواقع پر اللہ تعالیٰ کا ذکر مختلف اسماء کے ساتھ اور الگ الگ ترتیبوں سے پاتے ہیں جیسے :

رب الناس ملک الناس اله الناس (الناس :۱-۳)

(انسانوں کا رب، انسانوں کا بادشاہ، انسانوں کا الٰہ)

یا رب العالمین الرحمن الرحیم ملک یوم الدین (فاتحہ :۱-۳)

(کائنات کا رب، رحمٰن ورحیم، روز جزا کا مالک)

یا الملک القدوس العزیز الحکیم (جمعہ :۱)

(بادشاہ، پاکیزہ، غالب، حکمت والا)

یا العزیز الغفور (غالب، بخشنے والا)

یا الملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر (حشر: ۲۳)

(بادشاہ، پاکیزہ، سکھ، امن دینے والا، نگہبان، غالب، زبردست، بڑائی والا)

جو شخص قرآن مجید کو غور سے پڑھنے کا عادی نہیں وہ نہ کلمات کے موقع و محل کی طرف توجہ کرتا ہے اور نہ ان کے خاص پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ایک صاحب نظر اور حقیقت کے متلاشی پر جب ایک مرتبہ بعض ظاہر پہلو واضح ہو جائیں تو اس کے لیے مزید غور و فکر کو ترک کرنا آسان نہیں رہ جاتا۔ وہ آگے کی حقیقتوں سے واقف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

اگر تمہیں مذکورہ بالا حقیقت سے اتفاق ہے تو تم قرآن مجید میں دی ہوئی انبیاء ورسل کے ناموں کی ترتیب میں آسانی سے غور کر سکو گے۔ ظاہر ہے کہ ان کے درجے الگ الگ ہیں اور قرآن مجید میں ان کا تذکرہ متنوع ترتیب اسماء کے ساتھ آیا ہے۔ اگر تم موقع و محل پر غور کرو گے تو گہرے اشارات تک رسائی ہو گی۔ قصوں اور احکام کی ترتیب میں بھی تم اسی طرح کے خاص اشارات کی طرف رہنمائی پاؤ گے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ کسی شے کے اشارات و اعتبارات اس کے محل سے تلاش کیے جا سکتے ہیں جیسا کہ لفظ مشترک کے معانی متعین کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس لیے ترجیح تاویل کا پہلا اصول یہ ہے کہ معانی کے متعدد احتمالات میں فیصلہ کن امر نظم ہوتا ہے۔

اس اصول کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ اگر لفظ غیر مشترک ہو تو اس کو ایک ہی معنی کے لیے محدود کرنا لازم نہیں آتا، جیسا کہ بعض اہل الرائے کا خیال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ مجاز بھی ہو سکتا ہے حقیقت بھی۔ وہ اپنے عمومی معنی میں بھی ہو سکتا ہے خصوصی

معنی میں بھی۔اس کے معنی کے پہلو بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔البتہ اس کا استعمال موقع و محل کے تقاضا کے تحت ہی ہوتا ہے۔

دوسرا اصول :

جب کلام مختلف احتمالات رکھتا ہو تو اس مفہوم کو ترجیح دی جائے گی جس کی نظیر باقی قرآن سے ملتی ہو۔جن معانی کو قرآن کی موافقت حاصل نہیں ہوگی وہ ترک کر دیے جائیں گے۔مثال کے طور پر آیت

ان اللہ یحول بین المرء و قلبه و انه الیه تحشرون
(انفال ۲۷)

(بے شک اللہ تعالیٰ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ کہ تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے)

کی دو تاویلیں ہو سکتی ہیں۔

ایک یہ کہ خدا تعالیٰ تمہارے ضمیر سے خود تم سے زیادہ واقف ہے۔

دوسری یہ کہ خدا آدمی کو اس کے ارادہ سے روک دیتا ہے۔

جہاں تک پہلی تاویل کا تعلق ہے اس کی نظیر قرآن میں موجود ہے۔ نظم بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ یہ نظم قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے مشابہت بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ بے شمار مقامات پر لفظ تحشرون تقویٰ کے ساتھ[۲۴] اور لفظ تقویٰ اللہ کے علم[۲۵] کے ہمراہ آتا ہے۔گویا آیت نے یہ تعلیم دی کہ اللہ سے ڈرو کیونکہ وہ تمہارے بھیدوں سے واقف ہے اور تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے۔اس تاویل کی معنی و نظم دونوں اعتبارات سے مشابہت موجود ہے۔

جہاں تک دوسری تاویل کا تعلق ہے اس کی بنا لوگوں نے ایک لفظی مشابہت پر اٹھائی ہے۔ قرآن میں آیا ہے :

و حیل بینهم و بین مایشتهون (سبا:۵۴)

(ان کے درمیان اور ان کی خواہش کی چیزوں کے درمیان پردہ حائل کر دیا گیا)

یعنی وہ اپنی خواہش کی چیزوں سے روک دیئے گئے۔

اگرچہ لفظی مشابہت کے بھی تاویل کی ایک بنیاد ہونے میں شبہ نہیں لیکن مذکورہ دلائل کی موجودگی میں یہ بنیاد کمزور ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک لفظ مشترک ایسے مختلف معانی کے لیے آسکتا ہے جن کا فیصلہ سوائے سیاق کلام اور صحت معنی کے کسی دوسری چیز کے ذریعہ سے نہیں کیا جاسکتا۔مثال کے طور پر آیت:

ان ابراهیم کان امة قانتا لله (نحل:۱۲۰)

(بیشک ابراہیم اللہ کی ایک فرمانبردار امت تھے)

میں لفظ امۃ کو لو۔اس آیت میں اس لفظ کے وہی معنی مراد نہیں ہو سکتے جن کے لیے یہ لفظ دوسرے مواقع پر استعمال ہوا ہے۔کیونکہ یہ معنی سیاق کلام کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔یہاں اس لفظ کے جو معنی مراد ہیں ان کی نظیر بھی قرآن میں نہیں ملتی۔ دوسرے مقامات پر امۃ کا لفظ تین معانی کے لیے آیا ہے۔

۱- مدت کے لیے[۳۶]

۲- لوگوں کی جماعت کے لیے[۳۷]

۳- راستہ کے لیے[۳۸]

البتہ جب ہم پہلے اور دوسرے اصول کو مدنظر رکھتے ہیں تو اس لفظ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ پہلے اصول کے تحت لفظ امۃ کے بعد قانتا جو لفظ آیا ہے وہ اس کی تفسیر کر رہا ہے۔امت کے معنی کامل فرمانبردار کے ہیں۔اور یہ لفظ قانت سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔

دوسرے اصول کی روشنی میں ہمیں حضرت ابراہیم کی اس صفت کے نظائر ملتے ہیں کہ وہ خدا کی کامل اطاعت کرنے والے تھے۔

امت کے معنی فرمانبردار کے آتے ہیں لیکن جمہور اہل لغت سے لفظ کے یہ معنی مخفی رہ گئے ہیں اگرچہ وہ اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔(ر:۲۶۷-۲۶۹)

تیسرا اصول:

ترجیح تاویل کا تیسرا اصول احسن پہلو رکھنے والی تفسیر کو ترجیح دینا ہے۔احسن پہلو رکھنے سے یہ مراد ہے کہ وہ بلند حقائق اور عمدہ اخلاق سے مطابقت رکھتی ہو، دلوں کے لیے بالکل واضح ہو، قرآن کی محکم آیات کے مطابق ہو، اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں اچھا ظن پیدا کرتی ہو اور عربی زبان کے اعتبار سے اس کا بیان ظاہر ہو۔

اگر تفسیر قرآن کے بنیادی اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے احسن پہلو رکھنے والی تفسیر اختیار کی جائے تو یہ تفسیر تفسیر بالرائے نہیں کہلائے گی بشرطیکہ یہ تفسیر کے چار بنیادی اصولوں کے مطابق ہو۔اور اس کو روایات پر مبنی تفسیر پر ترجیح حاصل ہو گی کیونکہ ان روایات میں اکثر اہل تاویل کی آراء بیان ہوتی ہیں اور بسااوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان پر احسن تاویل واضح نہیں ہوتی۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ روایات کا خاص لحاظ رکھنے کے باوجود وہ تاویل اختیار کرتے ہیں جو انہیں احسن نظر آتی ہے اور باقی روایتیں ترک کر دیتے ہیں۔مثال کے طور پر سورہ یوسف کی آیت لقد کان فی قصصہم عبرۃ لاولی الالباب (یوسف ۱۱۱)
(بلاشبہ ان کے واقعہ میں اہل عقل کے لیے عبرت ہے) کے تحت لکھتے ہیں:-

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں عقل مندوں کے لیے عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کا موقع ہے۔یوسف کو ہلاک کرنے کے لیے گہرے کنویں میں ڈال دیا گیا۔پھر انہیں ایک حقیر رقم کے عوض فروخت کر دیا گیا۔ایک عرصہ تک قید خانے میں رہنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں مصر کی حکومت عطا کی اور ملک میں اختیار دیا۔جن بھائیوں نے ان کے

ساتھ برا سلوک کیا تھا ان پر فوقیت دی۔ ایک عرصہ دراز کے بعد اپنی قدرت سے انہیں والدین اور بھائیوں سے ملایا اور ان کو ایک دور دراز مسافت سے لا کر یوسفؑ کے پاس پہنچا دیا۔ حضرت یوسفؑ کی اس تاریخ کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کی قوم کے مشرکین سے کہا کہ اگر تم عبرت حاصل کرنا چاہو تو تمہارے لیے یوسف کے قصہ مین عبرت کا سامان ہے۔ جس خدا نے یوسف اور اس کے بھائیوں کے ساتھ یہ کچھ کیا وہ ایسے حالات پیدا کرنے سے عاجز نہیں ہے کہ محمد ﷺ کو تمہارے درمیان سے نکال کرلے جائے، پھر انہیں تم پر غلبہ عطا کرے، ملک کو ان کے قبضہ میں دے دے اور پیروکاروں اور ساتھیوں کے لشکروں کے ساتھ ان کی تائید کرے۔ خواہ انہیں اس میں مشکلات کا سامنا ہی کرنا پڑے اور اس میں کچھ مدت لگ جائے۔ اس آیت کے بارے میں مجاہد کا قول یہ ہے کہ "اس قصے میں یوسف اور ان کے بھائیوں کے لیے عبرت تھی"۔

اس کے بعد ابن جریرؒ مجاہد کی روایت اس کے مختلف طریقوں سے نقل کرکے لکھتے ہیں :-

"یہ قول مجاہدؒ کا ہے۔ آیت اگرچہ اس تاویل کی بھی محتمل ہو سکتی ہے تاہم اس کے متعلق جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ یہ آیت نبی ﷺ اور آپ کی قوم کے تذکرہ کے بعد اور خدا اور رسول کے ساتھ کفر پر مشرکین کو ملامت و وعید کرنے کے بعد آئی ہے۔ یہ آیت حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کے قصہ سے مربوط نہیں بلکہ اس میں تمام اہل عقل سے متعلق ایک عام خبر دی گئی ہے کہ وہ اس قصہ میں عبرت کا سامان پائیں گے۔ ان میں کسی کو کسی پر تخصیص نہیں دی گئی"۔

ابن جریرؒ کے اس اشارہ سے واضح ہے کہ انہوں نے پہلے نظم سے استدلال کیا ہے اور اس کے بعد دوسرے درجہ پر عبارت سے۔

چوتھا اصول :

ترجیح تاویل کا چوتھا اصول یہ ہے کہ تاویل میں الفاظ کے معروف معانی اختیار کیے جائیں کیونکہ ایک لفظ کے جو معانی کلام عرب میں کثرت سے مستعمل ہوں اس وقت تک ترک نہیں کیے جاسکتے جب تک اس کے لیے نہایت مضبوط وجوہ موجود نہ ہوں۔ جب دو تاویلیں باقی پہلوؤں مثلاً نظم، موافقت قرآن اور عقائد کے لحاظ سے برابر ہوں تو لازم ہے کہ ہم ہر لفظ کے معروف معنی مراد لیں۔ اس کی مثال لفظ الشوی ہے۔ کلام عرب میں اس کے معروف معنی لحم الساق (پنڈلی کا گوشت) ہیں۔ شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ معارج کی آیت نزاعۃ للشوی کے ترجمہ میں شوئی سے مراد کلیجہ لے لیا ہے۔ حالانکہ اگر سیاق کلام کو مد نظر رکھا جائے تو موقع منکرین کے دوزخ میں داخل ہونے کا نہیں بلکہ عذاب کے قرب کے تذکرہ کا ہے۔ فرمایا ہے۔

سأل سائل بعذاب واقع للكافرين ليس له دافع من الله ذى المعارج تعرج الملائكة والروح اليه فى يوم كان مقداره خمسين الف سنة فاصبر صبرا جميلا انهم يرونه بعيدا و نرهٰ قريبا يوم تكون السماء كالمهل و تكون الجبال كالعهن ولا يسئل حميم حميماً يبصرونهم يود المجرم لو يفتدى من عذاب يومئذ ببنيه و صاحبته و اخيه و فصيلته التى تؤيه و من فى الارض جميعا ثم ينجيه كلا انها لظى نزاعة للشوى تدعوا من ادبر وتولى وجمع فاوعى۔(معارج :۱-۱۸)

(ایک (استہزاء کرنے والے) سائل نے عذاب کا مذاق اڑایا جو واقع ہو کر رہے گا- کافروں کے پاس اس کا دافع نہیں- وہ خدائے صاحب درجات کی طرف سے ہو گا جس کی طرف روح اور فرشتے چڑھتے ہیں، اس دن جس کا اندازہ پچاس ہزار برس کا ہے- پس تو عمدگی سے ثابت قدم رہ- یہ لوگ اسے بعید پاتے ہیں لیکن ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں- جس دن آسمان ایسا ہو گا جیسے تیل کی تلچھٹ اور پہاڑ ایسے ہوں گے جیسے دھنی ہوئی اون- اور کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ان کو دکھائے جائیں گے- اس دن ہر مجرم چاہے گا کہ کاش عذاب سے چھوٹنے کے لیے اپنے بیٹے، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے اس کنبہ کو جو اس کی پناہ رہا ہے، اور زمین میں جو کوئی ہے سب کو فدیہ میں دے دے اور اپنے آپ کو نجات دلائے- نہیں ایسا ہر گز نہ ہو گا- وہ آگ کی لپٹ ہو گی جو پنڈلی کا گوشت اڑا لے جائے گی- ان لوگوں کو اپنی طرف بلائے گی جنہوں نے اعراض کیا، مال جمع کیا اور اس کو سینت سینت کر رکھا)

یعنی اس آیت میں موقف کا بیان ہوا ہے- اس روز جنت متقین کے قریب سے قریب تر کر دی جائے گی اور دوزخ گمراہوں کے پاس لائی جائے گی- اس روز ان کا کوئی دوست پرسان نہ ہو گا- دوزخ کفار کو اپنی طرف بلائے گی اور اپنی ایک لپٹ سے ان کی پنڈلی کا گوشت اڑا لے جائے گی- جہاں تک کلیجہ نکالنے کا تعلق ہے اس کے متعلق قرآن نے کہیں خبر نہیں دی ہے-

جن لوگوں نے شوی کو سر کی کھال کے معنی میں لیا ہے انہوں نے بھی غلطی کی ہے- اس معنی میں یہ لفظ بہت کم آیا ہے اور جہاں کہیں آیا ہے وہاں بھی اس کے معروف معنی ہی کا احتمال موجود ہے- پھر قرآن و حدیث میں آگ کی اس کیفیت کا ذکر نہیں آیا کہ وہ بالکل اوپر سے سر کی کھال اڑا لے جائے گی-

بالفرض اگر شوریٰ کے یہ دونوں معنی برابر قرار دیے جائیں جب بھی ان میں سے وہی اختیار کیا جائے گا جو نظم سے زیادہ موافقت رکھتا ہو اور باقی قرآن سے بھی اس کے دلائل ملتے ہوں۔

اسی طرح کی ایک مثال آیت :

فصل لربک وانحر (کوثر : ۲) (پس تو اپنے رب کی نماز پڑھ اور قربانی کر)

میں کلمہ انحر ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے سینے پر ہاتھ باندھنے اور بعض نے رفع یدین کرنے کا حکم مراد لیا ہے۔ لیکن یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔ ان تاویلوں کی حکم نماز سے مناسبت کو دیکھ کر لوگ کسی دھوکے میں مبتلا نہ ہوں کیونکہ قربانی کا حکم نماز کے ساتھ زیادہ خوبصورت اور وسیع تر مناسبتیں رکھتا ہے۔

پانچواں اصول :

ترجیح تاویل کا پانچواں اصول یہ ہے کہ اگر کوئی مفہوم کلام میں موجود عبارت کے علاوہ کسی دوسری عبارت کا تقاضا کرتا ہو تو یہ مفہوم مرجوح قرار دیا جائے گا۔ تغنی بالقرآن کے مفہوم کے تعین میں حضرت عائشہؓ اور امام شافعیؒ نے اسی اصول سے استدلال کیا۔

حدیث 'من لم یتغن بالقرآن' کے ضمن میں ابن عیینہؒ کا خیال تھا کہ اس کا مطلب ہے یستغنی بالقرآن۔ جب امام شافعیؒ سے اس کی بابت سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا "ہم اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اگر ابن عیینہ کے بتائے ہوئے استغناء کے معنی مراد ہوتے تو حدیث کے الفاظ یوں ہوتے کہ 'من لم یستغن بالقرآن' چونکہ لم یتغن کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس لیے حدیث کا مفہوم استغنا نہیں بلکہ تغنی ہے[۳۹]۔ (ر :۲۶۹-۲۷۳)

ج- غلط اصول

قرآن کی تاویل حدیث کی روشنی میں کرنا جبکہ حدیث کی تاویل قرآن کی روشنی میں ہونی چاہیے

قرآن مجید کی کتنی ہی آیات ایسی ہیں کہ اگر تم ان پر غور کر کے ان کے معنی کو سمجھو گے تو تمہیں بہت سی احادیث اس معنی کے موافق مل جائیں گی- حدیث قرآن پر کوئی اضافہ نہیں کرے گی بلکہ آیت کے کسی گہرے پہلو کو نمایاں کر دے گی جو ممکن ہے غور نہ کرنے والے آدمی پر مخفی رہ جائے- مثال کے طور پر آیت میراث میں تم دو وصیتوں کا ذکر پاؤ گے- ایک وصیت اللہ کی ہے جسے اس نے 'فریضة من الله' قرار دیا- فرمایا:

آباء کم و ابناء کم لا تدرون ایهم اقرب لکم نفعا فریضة من الله ان الله کان علیما حکیما (نساء :۱۱)

(تم اپنے باپوں اور بیٹوں کے متعلق نہیں جان سکتے کہ ان میں سے کون تمہارے لیے سب سے زیادہ نافع ہو گا- یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے- بے شک اللہ ہی علم و حکمت والا ہے)

دوسری وصیت جس کا ذکر ہے وہ میت کی وصیت ہے اور اس کا لحاظ مقدم رکھا ہے- یہ بات ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ جاننے والا اور حکمت والا ہے اور اسی کی وصیت کو مقدم ہونا چاہیے- پس یہ لازم ہو گا کہ میت کی یہ وصیت خیرات کی نوعیت کی اس کے وارثوں کے علاوہ لوگوں کے حق میں ہو- تم دیکھو گے کہ نبی ﷺ نے اس بات کی تصریح یہ کہہ کر فرما دی کہ الا لا وصیة لوارث (آگاہ رہو، وارث کے حق میں کوئی وصیت نہ ہو)

یہیں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک حکم جب دوسرے کے متناقض ہو تو ایک کو دوسرے کی تخصیص کرنے والا مانا جائے گا تاکہ تناقض دور ہو جائے- نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے

اگر لوگوں کو کسی بات کی اجازت مرحمت فرمائی ہے تو اس کا اپنا حکم اس کے باعث ختم نہیں کر دیا جائے گا۔

یہاں حدیث اس بات کی تائید کرتی ہے جو تم نے قرآن پر غور کرنے سے سمجھی۔ لیکن یہیں ایک چیز پر خطر اور صحیح بات سے پھسلانے والی بھی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن کی بات کو اچھی طرح سمجھنے سے پہلے اگر تم حدیث پر پل پڑو گے جس میں صحیح اور سقیم دونوں طرح کی احادیث ہوں تو تمہارا دل بعض ایسی روایوں میں اٹک سکتا ہے جن کی قرآن میں کوئی اساس نہ ہو اور کبھی وہ قرآن کی ہدایت کے برعکس بھی ہوں۔ اس کے نتیجہ میں تم قرآن کی تاویل میں اعتماد حدیث پر کرو گے اور تم پر حق و باطل گڈمڈ ہو جائیں گے۔

پس سیدھا راستہ یہ ہے کہ تم قرآن سے ہدایت پاؤ۔ اس پر اپنے دین کی بنیاد رکھو، اس کے بعد احادیث پر نگاہ ڈالو۔ اگر کوئی حدیث بادی النظر میں قرآن سے ہٹی ہوئی ہو تو اس کی تاویل کلام اللہ کی روشنی میں کرو۔ اگر دونوں میں مطابقت کی کوئی صورت نکل آئے تو تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ اگر اس میں ناکامی ہو تو حدیث کے معاملہ میں توقف کرو اور قرآن پر عمل کرو۔ آخر ہمیں حکم بھی تو یہی ملا ہے کہ پہلے اللہ کی اطاعت کریں پھر رسول کی اطاعت کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں معاملے اصل میں ایک ہی ہیں۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم رسول اللہ ﷺ سے روایت پر اس کے کلام کو مقدم رکھیں تو پھر اس حکم کا مدعا کیا تھا؟

بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ تفسیر یا تو وہ ہوتی ہے جو سلف صالحین سے منقول ہو یا پھر اس کے خلاف ہوتی ہے تو وہ رائے پر مبنی ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی تفسیر اعتماد کے لائق ہے جبکہ دوسری قسم سے روکا گیا ہے۔ ان لوگوں نے اس سے یہ بھی نتیجہ نکال لیا کہ منقول تفسیر خواہ ضعیف ہو وہ اتباع کے زیادہ لائق ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر بہت سی تفسیریں لکھی گئیں۔ مثال کے طور پر محمد بن جریر الطبری اسی طرز پر ہے اور اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کی

مانند کوئی تفسیر تصنیف نہیں کی گئی- اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خاص اس طرز میں وہ فی الواقع ایسی ہی ہے- اس کے علاوہ تفسیر بغوی او. علامہ ابن کثیرؒ، سیوطیؒ اور دوسرے محدثین کی تفسیریں اسی نوع کی ہیں-

اس دعویٰ میں جو بات کہی گئی ہے اس پر حق کی ملمع کاری تو ضرور ہے لیکن اس کی تہوں میں گمراہ کن باطل لپٹا ہوا ہے- جو شخص اس باطل کی کسی کھائی میں جا گرا وہ اس سے کبھی نکل نہ سکا، الا ماشاء اللہ - ہم جب تک ان لوگوں کی تفاسیر میں سے متعدد مثالیں بیان نہ کریں ان کے باطل کی حقیقت کو کھولنے کے درپے نہیں ہو سکتے-(ر ۲۷۵-۲۷۶)

اصل میں لوگوں کو جس چیز نے قرآن کی تاویل حدیث کے مطابق کرنے کی ترغیب دی وہ یہ ظن تھا کہ احادیث قرآن کی تفسیر کرنے والی ہیں- لیکن انہوں نے بعض امور کی طرف بالکل توجہ نہیں دی- مثلاً

۱- علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر خود کرتا ہے- پس لازم ہے کہ یہ تفسیر راجح قرار دی جائے-

۲- جب دو حدیثیں ایک دوسری سے ٹکراتی ہوں تو محدثین اس حدیث کو قبول کرتے ہیں جو زیادہ ثابت شدہ ہو- جب یہ ٹکراؤ قرآن اور حدیث میں ہو رہا ہو تو وہ اس اصول کو کیوں کام میں نہیں لاتے!

۳- جب دو حدیثیں سند میں یکساں طور پر مضبوط ہوں تو محدثین دو متعارض حدیثوں میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں- قرآن مجید کی سند سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے- پس لازم ہو گا کہ احادیث کی تاویل قرآن کی روشنی میں کی جائے نہ کہ قرآن کی تاویل حدیث کی روشنی میں ہو جس کی سند قرآن کی طرح قابل اعتماد نہیں- مثال کے طور پر قرآن میں آیت مباہلہ میں "ندع ابناء نا و ابناء کم و نساء نا و نساء کم" کے الفاظ ہوتے ہوئے ہم حدیث مباہلہ کی تاویل یوں کریں گے کہ جس طرح کسی خاندان کا آزاد کردہ غلام یا

اس کی پناہ میں آنے والا شخص یا اس کا جگری دوست اسی خاندان میں شمار کر لیا جاتا ہے اسی طرح نبی ﷺ کی اولاد اور آپ کے داماد آپ کے خاندان میں شمار ہونے کے زیادہ حق دار تھے۔

حدیث کی مدد سے تفسیر اسی وقت مامون ہوتی ہے جب وہ ایسے مقام میں ہو جس سے عقیدہ اور مذہب نہ قائم ہوتا ہو۔اس کے باوجود بھی وہ ظنی ہی کہلائے گی۔دوسری تفسیر کے امکان کے باوجود اسی ظنی تفسیر کو قبول کرنے والے سورہ الحجر ۹۰-۹۱ کی اس آیت کا مصداق ہوں گے جس میں ہے کہ المقتسمين الذين جعلوا القرآن عضين (تقسیم کرنے والے جنہوں نے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیے)۔روایت میں آتا ہے کہ کافر ایک دوسرے کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے کہتے کہ میں خود سورہ البقرہ لیتا ہوں اور تجھے المائدہ یا العنکبوت عطا کرتا ہوں۔تو آیت کے یہ معنی مامون تو ہیں لیکن غیر یقینی ہیں۔

باقی رہا قرآنی آیات کی تصدیق کے لیے احادیث کو نقل کرنا تو یہ ایک احسن عمل ہے۔ اسی طرح تاریخ میں سے بھی ہم ان چیزوں کے موافق شہادتیں نقل کرتے ہیں جن کی تصریح قرآن نے کر دی ہے۔(ر :۲۷۸-۲۷۹)

اصول تاویل

میں نے کلام کے نظام کی وضاحت کی تو معلوم ہوا کہ نظام سے تاویل کو جدا کرنا ممکن نہیں، یہ دونوں آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ لہذا میں مجبور ہو گیا کہ کلام کی تاویل کو بھی موضوع بناؤں۔ میں نے اس میں خیر کثیر پایا ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے جو تفسیر قرآن میں ایک مستقل اور عظیم مقام رکھتا ہے۔ اسی سے کلام اللہ کے مراد معنی کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ اگرچہ اس علم کے قواعد کا ہر کلام پر اطلاق ہوتا ہے لیکن اس کا اصل نفع کتاب اللہ کا فہم اور اس کے محاسن سے واقفیت حاصل ہوتا ہے۔ اور اسی کے نتیجہ میں نفوس ہدایت پاکر غایت کمال کو پہنچتے ہیں۔ (ر: ۲۰۹-۲۱۱)

تاویل، تحریف اور تفصیل

تاویل کسی ایسی چیز کی حقیقت کو کہتے ہیں جس کی خبر تمثیل کے انداز میں اس سے ملتی جلتی کسی چیز کی روشنی میں کی گئی ہو۔ لہذا کلام کا وہ مفہوم لینا جو عقل اور نقل کی رو سے اس کے اندر پایا جائے تاویل ہے۔ اس کے برعکس کلام کے ایسے معنی لینا جن کا عقل اور نقل کی رو سے اس کے اندر احتمال نہ ہو تحریف ہے۔ تفصیل ان اجزا کا ذکر کرنے کو کہتے ہیں جن کا ذکر ایک جامع بات کہنے کے باعث خاص طور پر نہ ہو سکا لیکن وہ اس میں مراد ہیں۔

تاویل اور تفصیل کو خلط ملط کر دینے کا نقصان اس نقصان سے کہیں کم ہے جو تحریف کو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ملا دینے کا ہوتا ہے۔ کیونکہ تحریف سراسر باطل ہے۔ یہ اللہ پر جھوٹا بہتان ہے اور اس کے دین کو ڈھا کر اس کی جگہ دوسرا دین قائم کرنے کے ہم معنی ہے۔ کلمات کو ان کے مواقع و محل سے ہٹا کر تحریف کرنے پر یہود و نصاریٰ جس طرح گمراہ ہوئے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ پھر دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہود پر

کیسے لعنت کردی کیونکہ جس شخص نے نصرانیت کا حلیہ بگاڑا وہ نصاریٰ کا ایک دشمن یہودی تھا- جو شخص خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کی ٹھان لے وہ اللہ تعالیٰ کے شدید غضب کا مستحق ہو جاتا ہے- پھر جو لوگ اپنے دشمن کے پیروبن جائیں ان سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہوگا؟ یہود نے اپنی عادت کے مطابق یہی پر فریب کھیل مسلمانوں کے ساتھ کھیلنا چاہا لیکن اللہ نے ہمیں اپنی حفاظت میں لے لیا- ہم اس بات کی مزید وضاحت نہیں کریں گے ورنہ ہم اپنے موضوع سے دور نکل جائیں گے-(ر: ۲۲۷-۲۲۸)

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ حق آپس میں نہیں ٹکراتا- اب ایک شخص جو کسی ایسے عقیدہ کا حامل ہو جو اس کے نزدیک کسی دلیل سے ثابت ہو لیکن ظاہر قرآن اس سے موافقت نہ رکھتا ہو تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ قرآن کی تاویل اپنے عقیدہ کے موافق کر لے- اس دروازے سے بہت سی غلط تاویلات داخل ہوتی ہیں- کبھی ایسا بھی ہوا کہ لوگوں نے ایک تاویل اختیار کرلی جبکہ عقیدہ کی اصلاح اس تاویل کے بغیر بھی ممکن تھی- لہذا بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن فہمی میں تاویل کے خاص اصول استعمال کیے جائیں- اگر کوئی عقیدہ ظاہر قرآن کے موافق نہ ہو تو یا تو عقیدہ میں ایسی اصلاح کرلی جائے جس کے بعد وہ کتاب اللہ کے موافق ہو جائے، یا قرآن مجید پر مزید غور کیا جائے- شاید اللہ تعالیٰ موافقت کا کوئی پہلو روشن کر دے، یا اس بارے میں توقف کیا جائے- اصول تاویل سے ہٹ کر قرآن کے معنی کو پھیرنا تحریف کی صورت پیدا کر دیتا ہے-(ر: ۲۲۸)

اصول تاویل کا علم انسانی فہم کے مطابق قرآن مجید کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے- یہ اصول دو طرح کے ہیں- ایک وہ جو تاویل میں کجروی سے محفوظ رکھتے ہیں، دوسرے وہ جو ان حکمتوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جن پر اللہ کی کتاب مشتمل ہے- ان دونوں قسموں کے لیے جامع چیز نظم قرآن میں غور و فکر ہے- نظم ہی وہ مضبوط رسی ہے جس کو تھام کر ایک شخص کجروی سے محفوظ رہ سکتا ہے اور یہی وہ روشن چراغ ہے جو حکمتوں کی طرف رہنمائی

کرتا ہے کیونکہ آیات نظم میں آکر ہی حکمت کی حامل ہوتی ہے۔

اللہ تعالٰی کی اتاری ہوئی کتاب میں غور و فکر کتاب فطرت میں غور و فکر سے مشابہت رکھتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان نسبتوں کی کثرت کے لحاظ سے تفکر کے پہلو بھی پھیل جاتے ہیں اور باہمی نسبتوں کا حال یہ ہے کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ (ر: ۲۲۳)

بعض اصول تاویل :

۱۔ قرآن کی حیثیت اللہ کے کلام کی ہے اس لیے اس کا کوئی حصہ دوسرے حصہ کے مخالف نہیں ہے۔ لہٰذا تاویل میں بھی یہ بات ملحوظ ہونی چاہیے کہ تاویل قرآن کی مخالف نہ ہونے پائے۔

۲۔ قرآن میں اس بات کی صراحت ہے کہ متشابہ کو محکم کی طرف لوٹایا جائے گا۔ لہٰذا جو بات قرآن سے یقینی طور پر ثابت ہوتی ہو تو اس کو محکم بنیاد قرار دیا جائے گا۔

۳۔ تاویل کے اصول ہم عقل سے اور نص قرآن سے حاصل کریں گے۔

۴۔ قرآن کا ظاہر حجت ہوگا ہم قرآن کو اس کے ظاہر سے پھیرنے کی کسی کمزور دلیل پر اعتماد نہیں کریں گے۔

۵۔ جہاں کسی تاویل کے لیے کئی احتمالات ہوں وہاں ہم اس تاویل کو اختیار کریں گے جو سب سے خوبصورت اور نظام اور عمود سورہ کے ساتھ سب سے زیادہ مطابقت رکھتی ہو۔ (ر: ۲۲۵)

ایک تاویل کی طرف رہنمائی دینے والے اصول :

پہلا اصول :

جب ایک آیت میں تاویل کے کئی پہلو ممکن ہوں وہاں معاملہ وہی ہوتا ہے جو مشترک لفظ کا ہوتا ہے۔ لفظ کے اشتراک کی صورت میں فیصلہ کن چیز لفظ کا موقع استعمال ہوتا ہے۔ تاویل کے مختلف ممکن پہلوؤں کی صورت میں بھی موقع آیت کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی

سے نظام کو سمجھنے کی شدید ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ تاویل میں اس قدر زیادہ اختلاف کا سبب کیا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ لوگوں نے نظام کا لحاظ نہیں کیا تو روایات پر پل پڑے اور گمراہی میں کھو گئے۔ امام شافعیؒ، باقلانیؒ اور معتزلہ کی ایک جماعت لفظ مشترک کے تمام معانی کو مراد لینا جائز سمجھتی ہے۔

موقع لفظ و موقع آیت کی طرح موقع سورہ کو نگاہ میں رکھنے میں بھی بڑی رہنمائی اور روشنی ملتی ہے۔

دوسرا اصول :

قرآن کے اسالیب کی خصوصیات کا علم بے حد ضروری ہے۔ ہر صاحب کلام کے کلام کی بعض صفات اس کے ساتھ خاص ہوتی ہیں۔ اگر ان کا لحاظ نہ کیا جائے اور ان کو سمجھے بغیر تاویل کی جائے تو معنی غلط ہو جائے گا۔

قرآن کا ایک اسلوب اختصار ہے۔ اسی اختصار کا ایک پہلو یہ ہے کہ قرآن مختلف جماعتوں کو ایک ہی عمومی جواب دے دیتا ہے کیونکہ وہ سب اس میں مشترک ہوتی ہیں اور اسی میں حکمت ہوتی ہے کیونکہ آدمی دوسرے کی غلطی سے متنبہ ہو جاتا ہے، خصوصاً جب مذہب کا معاملہ درپیش ہو۔ اس کا سبب ان میں اپنے مذہب کے لیے تعصب اور جدال کا پایا جانا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی چیز دوسرے مذہب والے اختیار کر لیتے ہیں تو یہ اس سے فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ لہذا جب غیروں کے مذہب میں پائی جانے والی غلطی ان کو اپنے مذہب میں بھی نظر آتی ہے تو یہ بات کو بخوبی سمجھ جاتے ہیں۔ لہذا اسی اسلوب میں ایجاز و اختصار بھی ہے اور پیغام کا بخوبی پہنچا دینا بھی۔ اس اسلوب کی مثال سورہ انعام اور سورہ زخرف میں ملتی ہے۔ قرآن نے مشرکین اور اہل کتاب دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عام اسلوب میں بات کہی ہے۔ اسی طرح سورہ بقرہ اور بعض دوسری سورتوں میں یہود اور نصاریٰ سے مشترک بات کی ہے۔

تیسرا اصول :

جب عبارت کے اندر ایک کلمہ ایک سے زیادہ معانی کا حامل ہو تو اس صورت میں یہ سوچنا ہوگا کہ کیا یہ کلمہ کسی دوسرے کلمہ سے زیادہ فلاں معنی دینے کے لائق ہے ؟ اگر کوئی دوسرا لفظ زیادہ موزوں اور درست نظر آئے جبکہ قرآن نے اس کو ترک کیا ہو تو ہم بھی اس مفروضہ معنی کو ترک کر دیں گے اور تاویل اس معنی کے لحاظ سے کریں گے جو اس سے زیادہ واضح اور چست ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کلام میں واضح ترین اور چست الفاظ کو کبھی ترک نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر سورہ بقرہ کی آیت و علی الذین یطیقونہ فدیة طعام مسکین میں الذین یطیقونہ سے مراد ہر صاحب استطاعت ہے، جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ کے مصنف کا خیال ہے۔ فعل اطاقۃ جسمانی قوت کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ خنساء کا شعر ہے۔

ـ وصبرا ان اطقت ولم تطیقی ۔

(اگر میں طاقت رکھتا تھا اور تو ایسا نہ کر سکی تو صبر کرنا ہوگا)

قرآن میں بھی طاقۃ جسمانی قوت کے معنوں میں آیا ہے۔ فرمایا :

قالوا لا طاقة لنا الیوم بجالوت (بقرہ : ۲۴۹)

(کہنے لگے آج ہمارے اندر جالوت سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے)

اس اصول سے ہماری مراد وہ نہیں ہے جو بعض لوگوں نے حقیقت کو مجاز سے افضل قرار دینے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ اور اس کے عرش پر متمکن ہونے کو بیٹھنے کے معنی میں لے لیا۔ بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ قرآن میں جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کا مفہوم متعین کرنے کے لیے ہم کوئی ایسا معنی نہ اختیار کریں جو خود زیادہ موزوں ہوتا اگر قرآن اس کو اختیار کرتا۔

اسی اصول کو مد نظر رکھ کر امام شافعی رحمہ اللہ نے حدیث 'من لم یتغن

بالقرآن' کے ضمن میں ابن عیینہ کی تاویل کی مخالفت کی۔

چوتھا اصول :

۱- دوسری آیات کے ساتھ موافقت ہونا ضروری ہے۔

۲- سابقہ آسمانی کتابوں کے ساتھ موافقت دیکھی جائے گی۔اس کی تفصیل ہم دوسری جگہ بیان کر چکے ہیں۔

۳- عقل اور برہان کے ساتھ موافقت ہونی ضروری ہے۔

۴- پچھلی امتوں کی تاریخ اور بندوں کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت سے جو کچھ ثابت ہے اس کے ساتھ موافقت دیکھی جائے گی۔

۵- جو تاویل منکر اور شاذ ہو گی اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔اس طرح کی تاویلات آیات یا عبادی الذین اسرفوا، الا المودة فی القربی اور ابتغوا الیه الوسیلة وغیرہ میں کی گئی ہیں۔(ر :۲۳۹-۲۴۱)

مراد معنی کو سمجھنے کا طریقہ

۱- تاویل القرآن بالقرآن :

قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے اور یہ چیز بالکل واضح ہے کیونکہ قرآن مختلف امور کا ذکر مختلف عبارتوں میں کبھی مجمل طور پر اور کبھی تفصیل کے ساتھ کرتا ہے۔ایک چیز کا تذکرہ ایک جگہ چھوڑتا ہے تو دوسری جگہ کر دیتا ہے۔ قرآن نے اپنی اس صفت کی صراحت کئی مواقع پر خود بھی کی ہے۔لہذا یہ صفت قرآن فہمی کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے۔

۲- نظم کلام کا لحاظ :

کلام میں مشترک الفاظ استعمال ہوتے ہیں یا کہیں حذف ہوتا ہے یا مقدر مفہوم ہوتا ہے

یا تعریض ہوتی ہے- اسی طرح مختلف اسالیب کی دلالتوں کے متعدد ہونے کے اعتبار سے بھی اشتراک پایا جاتا ہے- مثلاً امر، استفہام اور عطف کی دلالتیں مختلف ہوتی ہیں تو کلمات اور اسالیب بیان کی تمام دلالتوں سے واقف ہو کر معنی مراد کو سمجھنے پر غور ممکن ہوتا ہے-

الفاظ و اسالیب کے اشتراک کی صورت میں بھی اور محذوف کی تعیین، مقدر مفہوم اور تعریض کی صورتوں میں بھی خاص اصول ملحوظ رکھنے ہوتے ہیں- لیکن ان سب سے زیادہ مضبوط اور جامع اصول نظم کا لحاظ ہے- نظم کلام ہی بتاتا ہے کہ کسی مقام پر مقدر معنی کیا ہیں- کلام کی ترتیب میں کبھی مفہوم اشارہ یا اقتضائے کلام سے پہچانا جاتا ہے- مقدر ماننے کے لیے بھی کچھ چیزیں ملحوظ ہوتی ہیں- مثلاً مخاطب کو متعین کرنا اور خطاب کا سبب معلوم کرنا- مثال کے طور پر آیت اتی امراللہ فلا تستعجلوہ سبحانہ و تعالی عما یشرکون (نحل: ۱) پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ امر اللہ سے مراد وہ چیز ہے جس سے خدا کے رسولوں نے اپنی قوموں کو ڈرایا- فلا تستعجلوہ میں خطاب اس عذاب کے منکروں نیز مشرکین سے ہے کیونکہ وہی آخرت، حق کے لحاظ اور رب کی رحمت و عدل کی صفات پر مبنی حکمتوں سے غفلت میں پڑے ہوتے ہیں- عما یشرکون سے مراد وہ شریک ہیں جن کو پیغمبر کے لائے ہوئے پیغام (کہ اللہ کی ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ جزا لازم ہو) کے منکر مانتے ہیں-

۳- کلام کے عموم و خصوص کا فہم :

ہر کلمہ اور کلام کے کئی پہلو ممکن ہوتے ہیں جن میں سے کسی خاص مقام پر مراد معنی کا تعین کرنا لازم ہوتا ہے- چند پہلو حسب ذیل ہیں-

۱- کبھی ایک لفظ کو محض نام یا کسی چیز کی پہچان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے- اس کے معنی کا خیال نہیں ہوتا- مثلاً قرآن، مومن، مسلم، الکتاب، کافرین، متقین وغیرہ کا استعمال اس طرح ہوا ہے کہ یہ بطور علم آئے ہیں- لفظی معانی کا لحاظ ان میں ضروری

نہیں ہوتا کہ لفظ کے مادہ اور صورت کا اس میں حوالہ ہو۔

ب۔ کبھی لفظ کے لفظی معانی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ مثلاً لفظ المتقون ایسے اشخاص کے لیے آئے گا جن کے اندر پرہیزگاری اور خشوع کی صفات پائی جاتی ہوں۔

ج۔ لفظ سے کبھی مراد ایک فرد کامل ہوتا ہے۔

د۔ کبھی اس سے مراد مطلق عموم ہوتا ہے۔

ہ۔ کبھی وہ کسی خاص مفہوم کے لیے آتا ہے۔

و۔ کبھی وہ خاص ہوتا ہے لیکن مراد اس سے عام ہوتی ہے۔

ز۔ کبھی اس کے مطلقاً جامع معنی مراد ہوتے ہیں۔

ح۔ اور کبھی جامع معنی کے باوجود یہ مطلوب ہوتا ہے کہ خاص پہلو کو اولیت دی جائے۔

۴۔ الفاظ کا استعمال :

ا۔ ایک لفظ کا مفہوم اپنی مقدار، کیفیت اور طول زبان کے لحاظ سے کم و بیش ہوتا ہے۔ نظم کلام ہی اس بات کا تعین کرتا ہے کہ اصل مراد کیا ہے۔ مثال کے طور پر آیت امنوا و عملوا الصلحات و اقاموا الصلوۃ و آتوا الزکوۃ کو لیجئے۔ اس کی ایک تاویل یوں ہو سکتی ہے کہ ایمان یہاں مجمل ہے۔ عمل کے مقابل میں اس کا ذکر ہوا ہے تو لازم ہے ایمان محض اعتقاد کے مفہوم میں ہو۔ عمل صالح نماز اور زکوٰۃ جیسے احکام شرعیہ کے مقابل میں آیا ہے اور اس کے یہ معروف معنی ہیں۔ یہ تاویل تقابل پر اس کی بنیاد ہونے کے باعث فہم سے قریب تر ہے۔ دوسری تاویل یوں ہو سکتی ہے کہ ایمان یہاں اعتقاد اور عمل دونوں پر مشتمل ہے۔ اس نے اجمال کی تفصیل عمل صالح کا ذکر کر کے کر دی ہے۔ عمل صالح نیکیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے ذکر سے کر دی۔ یہ ایک لفظ کے معانی کی مقداری کمی و بیشی کا بیان ہے۔

جہاں تک معانی کی کیفیت کا تعلق ہے یہ وہاں پائی جائے گی جہاں ذکر اس ایمان کا ہو جو

اعتقاد اور عمل دونوں پر مشتمل ہوتا ہے اور دل کے اندر گہری جڑیں رکھتا ہے- مثلاً فرمایا انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم......(انفال : ۲)

زمانی لحاظ سے معنی اس وقت مراد ہوتے ہیں جب اس پر مسلسل عمل مقصود ہو- یہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کے کرنے اور نہ کرنے پر ثواب اور سزا مقرر کی گئی ہوں- مثلاً فرمایا :

فمن اتقی و اصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون(اعراف : ۳۵)

۲- جو حکم کسی وصف سے متصف ذات کے لیے ہو تو وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے کہ اس صفت پر قائم رہا جائے- مثلاً آیت یضل اللہ الظالمین (ابراہیم : ۲۷) میں ضلالت کو ظلم کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے اور آیت واللہ یحب المحسنین (مائدہ : ۹۳) میں اللہ کی محبت احسان کی روش کے ساتھ مشروط ہے- وہ کفار جو کفر پر اصرار کر کے کامل جمود تک جا پہنچے ان کا انجام اصرار موجود ہونے سے مشروط ہے- یہ بھی لفظ کے معانی کی کیفیت کی ایک مثال ہے-

۵- کئی پہلوؤں کے جامع معانی :

۱- آیت ان الانسان خلق ھلوعا اذا مسه الشر جزوعا و اذا مسه الخیر منوعا(معارج : ۱۹-۲۱) میں لفظ ھلوع جامع ہے جس کا معنی تنگ دلی ہے- اسی طرح آیت والصابرین فی الباساء و الضراء و حین الباس (بقرہ : ۱۷۷) میں لفظ صبر جامع ہے- اس کا مفہوم دل کا ثبات اور ثابت قدمی ہے-

قرآن ان جامع پہلوؤں کو ان مواقع پر کھولتا ہے جہاں ان کے کسی حجاب کا ذکر آیا ہو- اس کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر وضاحت کرتا ہے- یہ وضاحت اس نے اسلام اور ایمان کے جامع مفہوم کی بھی کی ہے-

۲- جامع اور مشترک لفظ میں فرق ہے- مشترک لفظ کے کئی معانی میں سے ایک معنی مراد ہوتا ہے- جامع لفظ کے کئی پہلو ہوتے ہیں- ان میں سے کبھی ایک پہلو کی طرف نص سے

اشارہ کر دیا جاتا ہے جو نظم کلام کے تقاضا کے مطابق ہوتا ہے اور باقی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ جامع کی ایک مثال اللہ احد میں کلمہ احد ہے۔ جن لوازم پر یہ دلیل ہے وہ سب اس کی مراد ہیں۔

محض جامع معنی کا وجود جس سے کئی معانی پھوٹتے ہوں ایک لفظ کو مشترک کی قسم سے نہیں نکالتا۔ مثلاً لفظ 'کتاب' وحی، شریعت اور عہد کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ یا لفظ قطیعہ ریوڑ کے لیے بھی آتا ہے اور قطع رحم کے لیے بھی۔ جب ان مختلف پہلوؤں کو جمع کرنا ممکن ہو تب لفظ کو جامع قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں جامع اور مشترک کا فرق نہایت باریک رہ جاتا ہے۔

جامع لفظ میں لفظ کی دلالت جامع معنی پر ہی ہوتی ہے۔ مشترک لفظ میں کبھی اس کا ماخذ تو جامع ہوتا ہے لیکن اس کی طرف رخ بالکل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر لفظ 'العصر' دن کے آخری حصہ اور گزرے ہوئے زمانہ دونوں کے لیے مشترک ہے اور ماخذ جامع ہے لیکن لفظ کی دلالت کسی ایک معنی کو چھوڑ کر دوسرے معنی پر نہیں ہے۔

۳- اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کتاب مبارك ليدبروا آياته- اس میں لفظ مبارک کا مطلب ہے بے حد حکمت و خیر والی۔ اس تاویل کی طرف ہماری رہنمائی لفظ مبارک اور اس کے نظم نے کی ہے۔ تدبر کا مقصد کلام کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا اور ایک پہلو سے دوسرے کی طرف منتقل ہونا ہے۔ یہاں تک کہ حکمت کے دروازے کھل جائیں۔ لفظ آیات نے بھی اس کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے۔ کیونکہ لفظ 'آیت' سوچ اور استدلال کا مرکز ہے اور یہ بے شمار معانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً فرمایا سنريهم آياتنا في الافاق و في انفسهم حتى يتبين لهم انه الحق (فصلت: ۵۳) یہاں مراد یہ ہے کہ آیات اس بات کی شاہد ہیں کہ جزا حق ہے۔ اسی طرح قرآنی آیات بطریق اشارہ رہنمائی دیتی ہیں، جیسا کہ فرمایا: و يتفكرون في خلق السماوات والارض ربنا ما

خلقت ھذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار (آل عمران : ۱۹۱) مراد یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق حکمت پر دلیل ہے اور حق یہ ہے کہ یہی چیز جزا کے واقع ہونے کی نشانی ہے۔ چنانچہ قائل خدا کی حمد کرتا اور عذاب النار سے پناہ مانگتا ہے۔

(ر : ۲۴۷-۲۴۸)

۶۔ الفاظ و معانی کے مختلف پہلو :

الفاظ کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ مثلاً مثبت اور منفی کے لحاظ سے، خبر یا انشاء کے پہلو سے، جملہ کے اسمیہ یا فعلیہ ہونے کے لحاظ سے۔ پھر فعلیہ میں فعل ماضی، فعل جاری، فعل مستقبل مراد ہو سکتے ہیں۔ لفظ مبتدا یا خبر یا حال یا تمیز وغیرہ میں سے کچھ ہو سکتا ہے۔ پھر لفظ کے متعلق امکان ہوتا ہے کہ وہ حقیقت ہے یا مجاز اور اس کا مفہوم عام ہے یا خاص۔

ان مختلف پہلوؤں کی الگ الگ دلالتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً فعل کبھی عمل کے آغاز پر دلیل ہوتا ہے، کبھی اس کی تکمیل پر اور کبھی اس کے جاری ہونے پر۔

استفہام کبھی تو محض سوال کے لیے آتا ہے لیکن کبھی اثبات، نفی یا امر کا مفہوم دیتا ہے۔ کبھی خبریہ اسلوب بھی امر کا فائدہ دیتا ہے۔

تاویل کے لیے لازم ہے کہ آدمی ان تمام پہلوؤں پر نظر رکھتا ہو تاکہ مراد معنی سمجھ سکے۔ بہت سا تاویل کا اختلاف ان پہلوؤں پر نظر نہ ہونے کے باعث پیدا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر آیت ان الذین کفروا سواء علیھم ء انذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون (بقرہ : ۶) میں فعل کفروا سے مراد ہے کفر پر اصرار اور پختگی اور اس رویہ پر برابر قائم رہنا۔ لہٰذا اس سے مراد یہود اور مشرکین مکہ کا ایک خاص ٹولہ ہے یا پھر وہ لوگ جو انہی کی صفت کے حامل ہوں۔ ماضی کے صیغہ کا ان معانی میں استعمال عام ہے۔ مثلاً کان اللہ غفوراً رحیما (نساء : ۱۰۰) کا مفہوم ہے کہ اللہ دائمی غفور رحیم ہے۔ اسی طرح ان الانسان لفی خسر الا الذین اٰمنوا و عملوا الصلحت (العصر : ۲-۳)

میں خسران سے مستثنیٰ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ ایمان اور عمل صالح پر قائم رہے۔

آخرت کے انکار کے پہلو سے لیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ جو لوگ آخرت کے انکار پر اصرار کریں گے وہ بھی اس کتاب (قرآن) پر ایمان لانے والے نہیں۔ کیونکہ بنیاد کا انکار اس کی شاخوں کے انکار کو لازم ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق دوسری جگہ خبر دی گئی کہ ان کے انکار کے سبب سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔ بل طبع الله عليها بكفرهم فلا يومنون الا قليلا (نساء: ۱۵۵)

اس آیت میں اس سنت اللہ کا بیان ہے جس کے تحت موثر چیزوں کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ پھر اس آیت میں یہود کے عوام کے بارے میں ایک خبر دی گئی ہے۔ گویا یہ ایک موثر سے بالاتر ایک اور موثر ہے۔ اسی لیے فرمایا: فلا يومنون الا قليلا

۷۔ اثبات و نفی کے مختلف پہلو:

جملہ اسمیہ اور جملہ فعلیہ دونوں میں اثبات اور نفی کے اسلوب میں مختلف پہلو ملحوظ ہوتے ہیں۔ کبھی فعل کی نفی کی جاتی ہے کیونکہ اس فعل کا اثر کہیں نظر نہیں آتا، محض اس کی ابتدائی کیفیت ظاہر ہو رہی ہوتی ہے۔ مثلاً فرمایا:

وما يومن اكثرهم بالله الا وهم مشركون (یوسف: ۱۰۶)

(اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس طرح کہ وہ شرک کرنے والے بھی ہیں)

گویا ایمان کا آغاز تو ہے لیکن اس کا نتیجہ شرک سے اجتناب کی صورت میں سامنے نہیں آرہا ہے۔

اس سے ملتا جلتا اسلوب یہ ہے کہ فعل کی نفی ایک فاعل کے لیے کی جاتی ہے کیونکہ وہ اس فعل کا اثر پیدا کرنے کی از خود قدرت نہیں رکھتا۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے:

وما رميت اذ رميت ولكن الله رمى (انفال: ۱۷)

(جب تو نے خاک پھینکی تو یہ تو نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی)

یہاں ایک پہلو سے تو فعل (خاک پھینکنے) کا اثبات کیا لیکن دوسرے پہلو سے اس کی نفی کر دی- کیونکہ اس کا جو اثر ظاہر ہوا وہ فاعل کے بس کی بات نہ تھی-

نفی فعل کا اس سے ایک اور ملتا جلتا فائدہ یہ بتانا ہوتا ہے کہ وہ فعل ابھی اس حد تک نہیں پہنچا جس کو کوئی اہمیت دی جائے- مثلاً فرمایا:

قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (الحجرات: ۱۴)

(بتادو کہ تم ایمان نہیں لائے- ہاں یوں کہو کہ ہم نے اطاعت کرلی اور ابھی ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا ہے)

اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ابھی وہ ایمان نہیں لائے ہو جس کے بعد تم ایمان کے دعوے کے مستحق بن سکو- کیونکہ ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اگرچہ یہ ان کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے- یہ مفہوم جملے میں لمّا کے استعمال سے پیدا ہو رہا ہے-

فعل کی نفی فعل کے فائدہ کی نفی کے لیے بھی آتی ہے- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

ولا تکونوا کالذین نسوالله فانسہم انفسہم (الحشر ۱۹)

(اور ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو اللہ کو بھول بیٹھے تو اللہ نے ان کو خود ان کی جانوں سے غافل کر دیا)

اس سے خود بخود یہ مفہوم پیدا ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بھولنے والا نہیں ہے- اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ ان لوگوں کی طرف سے غفلت ظاہر ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی شدید احتیاج کے مرحلہ میں ان کی پروا نہیں کی اور ان پر نظر التفات نہیں فرمائی-

نفی فعل اس موقع پر بھی ہوتی ہے جہاں اس فعل کے لیے موثر وجود میں نہ آیا ہو- مثلاً فرمایا

ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم و یعلم الصابرین (آل عمران : ۱۴۲)

(کیا تو نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں جا داخل ہو گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو ممیز نہیں کیا جنہوں نے جہاد کیا اور تاکہ ممیز کرے ثابت قدم رہنے والوں کو)

یہاں اللہ کے علم کی نفی کر دی حالانکہ وہ تو خوب جانتا ہے کہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک لوگ جہاد پر استقامت نہ دکھائیں ان کا رویہ ایسا ہے جیسا کہ اللہ کو ان کی اس صلاحیت کا علم نہیں۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ کو اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اس سے کیا مانگنا چاہتا ہے لیکن وہ اس کی دعا کو سنتا اس وقت ہے جب وہ فی الواقع دعا کرتا ہے۔

۸۔ نفی سے مثبت مفہوم حاصل کرنا :

جب دو چیزوں میں تضاد پایا جائے تو ایک چیز سے جو کچھ ثابت ہو گا دوسری چیز سے اس کی نفی مفہوم ہو گی۔ مثلاً فرمایا :

ان الذین یکتمون ما انزل اللہ من الکتاب و یشترون بہ ثمنا قلیلا اولئک ما یاکلون فی بطونہم الا النار ولا یکلمہم اللہ یوم القیامۃ ولا یزکیہم ولہم عذاب الیم ۔(البقرہ : ۱۷۴)

(بے شک جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو خدا نے اپنی کتاب میں سے اتاری ہے اور اس کے عوض میں حقیر قیمت قبول کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹوں میں صرف دوزخ کی آگ بھر رہے ہیں۔ ان لوگوں سے خدا قیامت کے دن نہ تو بات کرے گا، نہ ان کو پاک کرے گا۔ ان کے لیے بس عذاب دردناک ہے۔)

اس کے متضاد معنی پر غور کیجئے تو ظاہر ہوگا کہ جن لوگوں میں کتمان حق کی یہ صفت یا اسی کی مانند خدا کے غضب کو دعوت دینے والی کوئی دوسری صفت نہیں پائی جائے گی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان لوگوں سے ہم کلام ہوگا اور ان کا تزکیہ فرمائے گا۔

اسی طرح مکذبین کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ :

کلا انہم عن ربہم یومئذ لمحجوبون (تطفیف : ۱۵)

(ہرگز نہیں، بلکہ اس دن وہ اپنے رب سے اوٹ میں رکھے جائیں گے)

اس کے متضاد معنی لینے سے ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ اہل ایمان قیامت کے دن حجاب میں نہیں ہوں گے۔

۹- فعل کے اطلاق کے مختلف پہلو :

۱- فعل کا اطلاق فعل کے ابتدائی معنی پر ہوتا ہے۔ مثلاً فرمایا :

اما ثمود فهديناهم فاستحبوا العمى على الهدى (فصلت :۱۷)

(رہے ثمود تو ہم نے ان کو ہدایت دی تو انہوں نے ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دے کر پسند کیا)

انا هديناه السبيل اما شاكرا و اما كفورا (الدھر : ۳)

(ہم نے اس کو راہ سجھادی، چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا)

ان دونوں آیتوں میں مراد ابتدائی ہدایت ہے جو ہر شخص کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے اور اس کو قبول کرنا یا رد کرنا انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

۲- فعل کا اطلاق اس کے نتیجہ پر بھی ہوتا ہے۔

وعصى آدم ربه فغوى (طہ :۱۲۱)

(اور آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی تو بھٹک گئے)

یہ نافرمانی کا فعل آدم علیہ السلام سے اس وقت ظاہر ہوا جب انہوں نے خدا کے حکم کے

خلاف ایک کام کیا- لیکن دوسری آیت میں خود قرآن نے وضاحت کی ہے کہ وہ رب کا حکم فراموش کر چکے تھے تب ان سے یہ فعل صادر ہوا- فرمایا:

ولقد عہدنا الی آدم من قبل فنسی ولم نجدله عزما
(طہ:۱۱۵)

(اور ہم نے اس سے پہلے آدم پر ایک عہد کی ذمہ داری ڈالی تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم کی پختگی نہیں پائی)

۳- فعل کا اطلاق اس موقع پر بھی ہوتا ہے جہاں اجازت یا حکم سے وہ فعل انجام پایا ہو- ہم عام بول چال میں کہتے ہیں کہ 'بادشاہ نے پل تعمیر کیا' حالانکہ وہ اس کے ہاتھوں سے تعمیر نہیں ہوتا بلکہ اس کے حکم سے تعمیر ہوتا ہے-

بندے کے فعل کے نتیجہ میں ہدایت وضلالت کے بارے میں جو سنۃ اللہ ظاہر ہوتی ہے وہ بھی اسی ذیل میں آتی ہے- جیسے فرمایا:

بل طبع اللہ علیھا بکفرھم (نساء:۱۵۵)

(بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کردی ہے)

یا انما انت منذر من یخشاھا (نازعات:۴۵)

(تم تو بس ان لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے والے ہو جو اس سے ڈریں)

یا لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا
ولھم آذان لا یسمعون بھا (اعراف:۱۷۹)

(ان کے دل ہیں پر یہ ان سے سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں پر یہ ان سے دیکھتے نہیں، اور ان کے کان ہیں پر یہ ان سے سنتے نہیں)

آخری آیت سے مراد یہ ہے کہ جب یہ لوگ اپنے دلوں، اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں کے استعمال سے سب سے اہم مقصد کو حاصل نہیں کر سکے تو گویا انہوں نے نہ کچھ سمجھا، نہ کچھ

دیکھا اور نہ کچھ سنا-

۱۰-اسم، صفت اور فعل کے اطلاق میں فرق :

اسم کا اطلاق وہاں ہوتا ہے جہاں ایک شے اپنی کامل ترین شکل میں ہو-اس سے کم تر پر صفت کا اطلاق ہوتا ہے، اور فعل محض ایک عمل کے وقوع کو ظاہر کرتا ہے-امام شافعیؒ نے لفظ 'المحصنات' کے معنی کے تعین میں غلطی کر دی- کیونکہ انہوں نے اسم اور فعل کے اطلاق کا فرق ملحوظ نہیں رکھا-

۱۱-لفظ کا اطلاق عام پر :

ایک لفظ عام کا اطلاق کبھی عام پر ہوتا ہے اور اسی حیثیت سے اس پر حکم کا اطلاق بھی ہوتا ہے- مثلاً فرمایا الاعراب اشد کفرا و نفاقا (برائۃ : ۹۷) (یہ اعراب (دیہاتی) کفر و نفاق میں زیادہ پختہ ہیں- یہاں اعراب لفظ عام ہے-لہذا جو حکم لگایا گیا ہے اس کا اطلاق بھی اعراب پر ان کی مجموعی حیثیت سے ہوگا-

کبھی حکم کا اطلاق عام پر ہوتا ہے لیکن یہ مجموعی اعتبار سے نہیں بلکہ ہر فرد پر ہوتا ہے- مثلاً هدی للمتقین (بقرہ :۲)(یہ ہدایت ہے متقین کے لیے) سے مراد ہر متقی فرد ہے-لہذا ہر معاملہ میں یہ دیکھنا لازم ہوتا ہے کہ عام سے مراد من حیث المجموع سب سے ہے یا اس مجموعہ کے افراد سے یا کسی فرد خاص سے- مفسرین کے ہاں ایسے امور میں اختلاف واقع ہوا ہے- مثلاً آیت :

> کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنکر (آل عمران :۱۱۰)
>
> (تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے ہو، معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو)

بعض مفسرین کے نزدیک عمومی حکم دے رہی ہے جس کا اطلاق امت کے ہر فرد پر ہے-اسی

لیے انہوں نے دوسری آیت :

ولتكن منكم امة يدعون الى الخير و يامرون بالمعروف و ينهون عن المنكر (آل عمران : ۱۰۴)

(اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے)

کی تاویل بھی عام افراد کے لیے کر دی- منکم کے مِن کو انہوں نے بیان کے لیے مان لیا- دوسرے مفسرین نے کلمہ مِن کو تبعیض کے لیے سمجھا اس لیے انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو امت کے ہر فرد پر لازم نہیں مانا-

اس دوسری تاویل کی رو سے بھی مِن کو بیان کے لیے ماننا ممکن ہے کیونکہ اگر امت کے وہ افراد جو فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اہل ہیں جب اس فریضہ کو ادا کریں تو اس کی نسبت امت ہی کی طرف کی جائے گی-

اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ امر و نہی کے اس حکم کو ہر فرد کے لیے مانا جائے کیونکہ حدیث کی رو سے اس کا حکم سب کو شامل ہے- آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ (تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور تم میں سے ہر شخص سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال کیا جائے گا)

اس طرح دونوں تاویلات پر نزاع ختم ہو جاتی ہے اگرچہ فرق دونوں میں نمایاں ہے-

۱۲- موصوف پر حکم کا اطلاق :

خاص اشخاص پر کوئی حکم لگایا جائے تو اس کی نوعیت اور ہے اور کسی کا ذکر اس کی صفت کے ساتھ کر کے حکم لگایا جائے تو اس کی حیثیت دوسری ہے- کیونکہ دوسری صورت میں حکم اس صفت کے حوالہ ہی سے اس کے ساتھ متعلق ہوتا ہے-

بعض صفات زائل ہونے والی ہوتی ہیں- ایسی صفات کا حکم بھی ان کے زائل ہونے کی

صورت میں زائل ہو سکتا ہے- مثلاً فرمایا :

ان الذین کفروا سواء علیهم ء انذرتهم ام لم تنذرهم لا یؤمنون(بقرہ :٦)

(جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے یکساں ہے انہیں ڈرائو یا نہ ڈرائو، وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں-)

اس آیت کا حکم لوگوں کے کفر کے ساتھ مشروط ہے اور کفر کبھی زائل بھی ہو جاتا ہے- ایمان بھی ایسی ہی صفت ہے- آیت :

الذین امنوا و عملو الصلحت طوبی لهم و حسن ماب (رعد :٢٩)

(جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کیے ان کے لیے خوشخبری ہے اور اچھا ٹھکانا ہے)

کا اطلاق بھی ایمان و عمل صالح پر قائم رہنے کی صورت میں ہے-

جو صفات زائل نہیں ہو تیں ان پر جس حکم کو مبنی کیا گیا ہو وہ بھی زائل نہیں ہو گا- مثلاً فرمایا :

السابقون الاولون من المهاجرین والانصار والذین اتبعوهم باحسان رضی الله عنهم ورضوا عنه و اعدلهم جنات تجری تحتها الانهر خالدین فیها ابدا ذلک الفوز العظیم-(توبہ :١٠٠)

(اور مہاجرین وانصار میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور پھر جن لوگوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی ہے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے- اور اس نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن

کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ان میں یہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور بڑی کامیابی یہی ہے)

اس آیت میں جن صفات پر اللہ کی خوشنودی کی بشارت دی ہے وہ ہیں اسلام لانے میں سبقت اور اللہ کی خاطر ہجرت۔ چونکہ یہ دونوں صفات زائل ہونے والی نہیں ہیں اس لیے اللہ کی خوشنودی کا حکم ان صفات کے حاملین کے لیے زائل نہیں ہوگا۔

اگر ان سابقون کا کوئی دشمن یہ دعویٰ کرے کہ اللہ تعالیٰ پہلے تو ان لوگوں پر راضی تھا بعد میں ناراض ہو گیا جب کہ یہ حقیقت ہے کہ جو مستقبل کے معاملات کو یقینی طور پر جانتا ہو تو وہ کسی سے بعد میں ہونے والی برائی کے علم کے باعث اس سے راضی نہیں ہو سکتا، تو اس قیاس کی نفی یہ کہہ کر کردی کہ خدا نے ان کے لیے جنت تیار کر رکھی ہے۔

اگر یہ شخص یہ دعویٰ کرے کہ اللہ تعالیٰ سراپا عدل ہے لہٰذا وہ ان لوگوں کے خیر کا اچھا بدلہ دے گا اور ان کے شر کا برا بدلہ دے گا تو اس گمان کی نفی کے لیے یہ کہہ دیا کہ وہ ہمیشہ ہمیش جنت میں رہیں گے۔ یہ وضاحتیں تاکید کے لیے اور باطل پرست کجرو لوگوں کے منہ بند کرنے کے لیے ہیں۔

۱۴۔ مطلق و جامع کلمات :

۱۔ ایک کلمہ جب مطلق ہو اور ساتھ ہی خاص سے متعلق ہو تو اسے اس ذات کے لیے مخصوص معنی میں لیا جائے گا لیکن اس کا اشارہ عام بھی مانا جائے گا تو اس طرح وہ جامع ہوگا۔ مثلاً المتقین اور الذین کفروا کے الفاظ ان لوگوں کے لیے تو نص کے حکم میں ہیں جن کے احوال کی ان میں خبر دی گئی ہے۔ لیکن ان میں ان تمام لوگوں کی طرف اشارہ بھی پایا جاتا ہے جو ان صفات کے حامل ہوں۔

۲۔ جس شخص کے بارے میں خبر دی جارہی ہو اگر اس کی تعبیر کسی صفت سے کی جائے تو حکم اس شخص کے لیے اس صفت کے موجود ہونے پر ہی خاص مانا جائے گا۔ مثلاً آیت ان

الذین کفروا سواء علیهم ءانذرتهم ام لم تنذرهم لا یومنون میں یہ بات کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، اس صفت کے حامل لوگوں کے لیے خاص ہو گی جن کی یہاں خبر دی گئی ہے- اس طرح یہ حکم ان لوگوں کے لیے تو خاص ہو گا جن کی طرف نص اشارہ کر رہی ہے، لیکن دوسروں کے لیے جن میں یہ صفت پائی جائے یہ حکم عام ہو گا-

۳- اس آیت کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ کا قول سورہ بقرہ میں یہود کے کفر کے بارے میں وحی کی خبر پر مبنی ہے- ان کا دوسرا قول تورات میں وارد مضمون پر مبنی ہے-

۱۴- حقیقت مطلقہ اور حقیقت مصطلحہ میں فرق:

مطلق حقیقت میں جو چیز مجاز ہوتی ہے کبھی کبھی وہ لغت میں حقیقت بن جاتی ہے- لوگوں سے جو خطاب ہوتا ہے وہ لغت کے مطابق ہوتا ہے- اب اگر کوئی شخص اپنے بھائی سے ان الفاظ میں بات کرے جن کو وہ نہ سمجھتا ہو تو وہ اس پر ظلم کرنے والا اور اسے فتنہ میں ڈالنے والا ہو گا- یہ بات جائز نہیں کہ تم کوئی ایسا سچ بول رہے ہو جس کا نتیجہ باطل کی صورت میں بر آمد ہو- مثلاً تم کہو کہ میں نے زید کو نہیں دیکھا، اور تمہارا مطلب یہ ہو کہ میں نے تو بس اس سے منعکس ہونے والی شعاع دیکھی جو زید نہیں ہے- یا تم کہو کہ 'میں نے زید کا کلام نہیں سنا' اور تمہارے دل میں ہو کہ میرے کانوں میں تو ہوا کی وہ موجیں پہنچی ہیں جو زید کے کلام سے پیدا ہوئی تھیں- یا تم یوں کہو کہ 'صحیح بخاری میں قول رسول نام کی کوئی چیز نہیں' اور تم یہ مفہوم لے رہے ہو کہ اس میں جو کچھ ہے اصل قول رسول تو نہیں ہے، صرف اس کی نقل ہے- یا یوں کہو کہ 'میرے ہاتھ میں کوئی مال نہیں' اور مطلب یہ ہو کہ تمہارے ہاتھ تو خالی ہیں جبکہ مال کسی تجوری میں رکھا ہو-

ہاں جب تمہیں کسی معاملہ کی حقیقت بتانی ہو تو تم اس کی وضاحت ایسے کلام سے کرو جس کو لوگ سمجھتے ہوں- اس طرح حقیقت مطلقہ کے مطابق تمہارا کلام جائز ہو گا-

یہ بات تو ایک لفظ کی حقیقت کے حوالہ سے تھی- معنی کے حوالہ سے بھی کتنے صحیح

مفاہیم مخاطب کے فہم سے بلند ہو جاتے ہیں تو وہ ان کو جھٹلا دیتا ہے اور کلام سے فائدہ نہیں اٹھاپاتا- بلکہ وہ تمہارے بارے میں سوء ظن میں مبتلا ہو کر تمہاری بات سننے سے انکار کر دیتا ہے- اگر تم اس سے بات اس انداز سے کرتے جس کو قبول کرنے کی استعداد اس میں ہوتی تو تمہارے لیے اسے سمجھانا ممکن ہو سکتا تھا- یہی صورت حال اعمال میں بھی ہوتی ہے-

اس واضح بنیاد سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ عقائد میں جس قدر اختلافات واقع ہوئے ہیں وہ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کے سبب سے واقع ہوئے ہیں-

۱۵- وجوہ کلام اور ان کی تاویل :

کلام کے مختلف پہلو ہوتے ہیں مثلاً وصل و فصل، تقدیم و تاخیر، زیادت و حذف، اجمال و تفصیل، اختصار و وضاحت- ان میں سب کی اپنی اپنی دلالتیں ہیں جو تاویل میں معانی کے مختلف پہلو سامنے لاتی ہیں- ان میں سب سے زیادہ باریک اور دقیق حذف کی تاویل ہے- جب آدمی محذوف کو کھولنا چاہے تو لازم ہوتا ہے کہ وہ کلام کے معانی اور اس کی حکمت، اس کے مفہوم کے ربط اور اس کے عمود پر نظر رکھتا ہو اور باقی کلام کے بارے میں وہ صحیح رائے قائم کر چکا ہو- یہ اس لیے لازم ہے کہ وہ کوئی منکر رائے نہ قائم کر لے یا کسی غلط تاویل کی طرف مائل نہ ہو جائے- لہذا ضروری ہے کہ وہ متعلقہ واقعات کے حقائق کا عالم ہو اور مضبوط اور کمزور میں فرق کرنے والا ہو-

۱۶- وضاحت اور ابہام :

اچھا کلام وہ ہوتا ہے جو وہم میں ڈالنے سے اجتناب کرے اور اس کی عبارت یقینی معنی دیتی ہو- لہذا قرآن کے معاملہ میں یہ ضروری ہے کہ اس کے کسی جملے کے وہ معنی نہ لیے جائیں جو اگرچہ ممکن تو ہوں لیکن ان معنی کو ادا کرنے کے لیے بہتر اسلوب موجود ہو- مثلاً آیت **ذلک ان لم یکن ربک مهلک القری بظلم و اهلها غفلون** (انعام :۱۳۱) میں **بظلم** سے مراد ہے ان کے اپنے اوپر ظلم ڈھانے کے سبب سے، اس کے

معنی ظلم کرتے ہوئے، نہیں ہیں- کیونکہ اگر موخرالذکر معنی مراد ہوتے تو اس کے لیے 'بظلم' کے بجائے ظلما کہنا زیادہ مناسب تھا-

۱۷- محذوف کے مقدر معنی :

محذوف کے مقدر معنی سمجھنے میں لوگوں نے اکثر غلطی کی ہے- سورہ فاطر آیت ۸ میں ہے-

افمن زین له سوء عمله فراه حسنا فانَ الله یضل من یشاء و یهدی من یشاء فلا تذهب نفسک علیهم حسرات ان الله علیم بما یصنعون-(فاطر :۸)

(کیا جس شخص کی بد عملی اس کی آنکھوں میں کھبا دی گئی اور وہ اس کو اچھا سمجھتا ہے تم اسے ہدایت دو گے کیونکہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے- پس ان کے افسوس میں تمہاری جان نہ چلی جائے- بے شک اللہ ان کے کرتوتوں کا علم رکھتا ہے)

اس میں ابتدائے کلام کے سوالیہ جملہ کا جواب حذف ہے- آیت کا اگلا حصہ یہ رہنمائی دیتا ہے کہ محذوف یہ ہوگا کہ تو کیا تم ایسے شخص کو ہدایت دو گے جس کو اللہ نے اپنے علم کے مطابق گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگادی اور اس کی نگاہوں پر پردہ ڈال دیا- تو اللہ کے بعد اسے کون ہدایت دے سکتا ہے-

۱۸- نظم کے مختلف پہلو :

جملے میں عطف کے موقع پر کلمات کی ترتیب کسی بات پر دلالت سے خالی نہیں ہوتی- علماء نے اس کی مدد سے استدلال کیا ہے- جو چیز پہلے بیان ہوتی ہے اس کے پہلے آنے کے پہلو کئی ہوتے ہیں- مثلاً :

۱- وہ بالکل واضح ہوتی ہے لہذا فہم سے قریب ترین ہوتی ہے-

۲- وہ مجمل ہوتی ہے لہذا اس کا احاطہ کرنا سہل تر ہوتا ہے-

۳- وہ مفصل ہوتی ہے کیونکہ مجمل کو بسااوقات موخر کر دیا جاتا ہے-

۴- اس کے شرف، مرتبے اور اولیت کا لحاظ ضروری ہوتا ہے-اس کا استعمال احکام میں ہوا ہے-مثلاً فرمایا:

حرمت عليكم امهاتكم و بناتكم و اخواتكم و عماتكم و خالاتكم و .(نساء ۲۳:۴)

(تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں)

یہ صعودی ترتیب ہے-

۵- نزدیک یا قریب ہونے کے باعث اس کو مقدم کر دیا جاتا ہے- ایسا نزولی ترتیب میں ہوتا ہے- مثلاً فرمایا.

افلا ينظرون الى الابل كيف خلقت و الى السماء كيف رفعت (الغاشیہ ۱۷-۱۸)

(کیا وہ اونٹوں پر نگاہ نہیں کرتے وہ کیسے بنائے گئے؟ اور آسمان کو نہیں دیکھتے کیسا اونچا کیا گیا؟)

یہاں تک ترتیب صعودی ہے اس کے بعد اگلی آیات میں پھر نزولی ترتیب ہے-گویا یہ ترتیب دوری ہوئی-

۶- تاریخی لحاظ سے وہ قدیم تر ہوتی ہے مثلاً فرمایا: ان الله اصطفى آدم و نوحا و آل ابراهيم و آل عمران على العالمين

۷- وہ خاص ہوتی ہے-اس لیے اکثریہ واضح ہوتی ہے-

۸- وہ عام ہوتی ہے-اس لیے وقتی طور پر وہ ظاہر ہوتی ہے-

۹- اس کے کسی پہلو سے لوگوں کو عادی کرنے کے لیے اسے پہلے لایا جاتا ہے-

۱۰- جو پہلے بیان ہو چکا ہوتا ہے اس کے تابع ہو کر آتی ہے-

۱۱- کبھی محض تلفظ کی ضرورت کے تحت ایک لفظ کو پہلے لایا جاتا ہے- مثلاً خلق الموت والحیوۃ- کبھی یہ ہوا ہے کہ بعض پہلو دوسرے پہلوؤں کی خاطر ترک کر دیے گئے ہیں- جو شخص تدبر نہیں کرتا اس پر یہ مواقع شبہات پیدا کرنے کا باعث بن جاتے ہیں- مثلاً بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ عقل کی نسبت سننے کی صلاحیت افضل ہے کیونکہ قرآن مجید میں آیا ہے :

وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر (الملک :۱۱)

(اور وہ کہیں گے کہ ہم سننے والے یا سمجھنے والے ہوتے تو ہم دوزخ والوں میں سے نہ ہوتے)

انہوں نے اس کو مذکورہ بالا نکات میں سے نکتہ ۴ کے تحت سمجھا حالانکہ اس کا تعلق نکتہ ۶ سے ہے- انسان پہلے سن کر علم حاصل کرتا ہے- جب بڑا ہوتا ہے تو سنی ہوئی چیزوں پر دوبارہ نظر ڈالتا ہے اور عقل سے فیصلہ کرتا ہے- اسی لیے ارشاد ہوا :

قل ھوالذی انشاء کم وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلا ما تشکرون (الملک :۲۳)

(کہہ دو وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے پر تم بہت ہی کم شکر ادا کرتے ہو)

یا فرمایا ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا (اسراء :۳۶)

(کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک چیز کی پرسش ہونی ہے)

فتنہ کی بات زیادہ تر پہلے کانوں میں پڑتی ہے، پھر اس کی طرف نظریں اٹھتی ہیں اس

کے بعد وہ دل پر قبضہ کر لیتی ہے۔

۱۹۔ مواقع تدبر :

۱۔ قرآن میں جو قصے بیان ہوئے ہیں، ان کا مقصود عبرت ہے۔ قصے کے واقعات اور قرآن کے مخاطبین کے احوال میں مطابقت دریافت کرنے کے لیے ان پر تدبر کی حاجت ہوتی ہے اور ضروری ہوتا ہے کہ ایسی مطابقتیں متعین کی جائیں۔ سورہ بقرہ میں طالوت کا قصہ اس موقع پر آیا جہاں لوگوں کو جہاد پر ابھارا گیا تھا تو صحابہ کرام نے مختلف مطابقتیں متعین کر لیں حتی کہ ان کو تعداد کا علم بھی ہو گیا۔ تمام قصوں پر اسی طرح غور ہونا چاہیے۔

۲۔ نظائر کو دیکھتے ہوئے جہاں الفاظ کے قرین بدل جائیں تو یہ غور طلب بات ہوتی ہے۔ یہ کلمات کی وسعت اور ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت پر دلیل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک مقام پر ہے :

وتوا صوا بالصبر وتواصوا بالمرحمه (البلد : ۱۷)

(اور انہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی)

اور اس کی نظیر دوسرے مقام پر ہے :

وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر (العصر : ۳)

(اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق اور صبر کی نصیحت کی)

یہاں یہ دیکھنا ضروری ہو گا کہ حق اور مرحمہ (ہمدردی) میں کیا مناسبت ہے۔ اس سوال کے جواب کے مطابق ہی آیت کی صحیح تاویل ممکن ہے۔

اسی طرح ایک آیت ہے :الذین امنوا و عملوا الصلحت (جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے) دوسرے مقام پر ہے الذین صبروا و عملوا الصلحت (ھود :۱۱) (جنہوں نے صبر کیا اور نیک اعمال کیے) تیسرے موقع پر ہے ان شکرتم و امنتم (نساء : ۱۴۷)(اگر تم نے شکر ادا کیا اور ایمان لائے) یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان اور صبر نیز ایمان و شکر میں کیا مناسبت ہے اور ایمان کے حدود کیا ہیں۔

ایک موقع کی آیت ہے :

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ما ارید منھم من رزق وما ارید ان یطعمون (ذاریات :۵۶-۵۷)

(اور میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں- میں ان سے نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ رزق کا سامان کریں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں)

دوسرے مقام پر یہ مضمون یوں ادا ہوا ہے :

وامر اھلک بالصلوۃ واصطبر علیھا لا نسئلک رزقا نحن نرزقک (طہ :۱۳۲)

(اور اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو، ہم تم سے رزق کا مطالبہ نہیں کرتے ہم تم کو رزق دیں گے)

اس نظیر کی روشنی میں معلوم ہوا کہ پہلی آیت میں عبادت سے مراد اللہ تعالیٰ کے لیے خشوع اور عاجزی ہے جس کی جامع تعبیر نماز ہے، جیسا کہ بعد والی آیت نے وضاحت کردی-

۳- قرین جس طرح نظائر میں دلیل ہوتا ہے اسی طرح نفس آیت میں بھی دلیل ہوتا ہے- جہاں ایک کلمہ کے مقابل میں دوسرا کلمہ رکھ دیا گیا ہو جب کہ اس کا ایک اور واضح تر مقابل بھی موجود ہو، مثال کے طور پر ایمان کا مقابل لفظ کفر ہے لیکن اگر اس کے بجائے مرض کا لفظ رکھ دیا گیا، تو لفظ کے حدود اور دونوں میں مناسبت کو سمجھنے میں مدد ملے گی- مثال کے طور پر فرمایا :

فاما الذین امنوا فزادتھم ایمانا وھم یستبشرون و اما الذین فی قلوبھم مرض فزادتھم رجسا الی رجسھم وماتوا وھم کافرون - (توبہ :۱۲۴-۱۲۵)

(سو جو سچ مچ ایمان لائے ہیں وہ ان کے لیے ایمان میں اضافہ کرتی ہے اور وہ اس سے بشارت حاصل کرتے ہیں- رہے وہ جن کے دلوں میں روگ ہے تو وہ ان کی نجاست پر ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیتی ہے اور وہ کفر ہی کی حالت میں مرتے ہیں)

اس آیت میں ایمان کے مقابل میں مرض اور رجس کے الفاظ لا کر یہ بتایا کہ مرض اور رجس شک کی تعبیر کے لیے آتے ہیں اور یہ نتیجہ بھی نکلا کہ ایمان شفا اور پاکیزگی ہے-

اسی طرح سورہ اللیل میں تقویٰ کے مقابل میں استغناء کا لفظ استعمال کیا ہے- فرمایا :

فاما من اعطی واتقی و صدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسری و اما من بخل واستغنی و کذب بالحسنی فسنیسرہ للعسری (اللیل :۵-۸)

(سو جس نے انفاق کیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ جانا تو اس کو تو اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا- اور جس نے بخالت کی اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم ڈھیل دیں گے کٹھن منزل کی)

☆☆☆☆☆

حواشی

۱۔ یہ اشارہ حضرت آدم کے واقعہ کی طرف ہے کہ انہوں نے اسماء کا علم حاصل کیا تو اس کے بعد ملائکہ تخلیق آدم کی حکمتوں سے بہرہ ور ہو گئے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ کی تربیت متقاضی ہوئی تو ان کو حکمت کے رموز سیکھنے کے لیے خضرؑ کے پاس بھیجا گیا۔ (مرتب)

۲۔ مولف رحمہ اللہ کا اشارہ شاید مستشرقین کی طرف ہے جن میں سے بعض کی رائے یہ ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب صحابہ کرامؓ بالخصوص زید بن ثابت کی مرہون منت ہے۔ مولانا فراہیؒ کے زمانہ میں شاید رچرڈ بیل کا ترجمہ قرآن معروف نہیں ہوا تھا۔ اس کو آیات کی ترتیب میں بھی شک ہوا ہے۔ اور اس نے اپنے زعم کے مطابق نئے سرے سے آیات کو مدون کیا ہے۔ لیکن اس کی قائم کردہ ترتیب اتنی گنجلک ہو گئی ہے کہ خود مستشرقین اس کی افادیت کے قائل نہیں ہوئے۔ (مرتب)

۳۔ لف و نشر علم بیان کی اصطلاح میں اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں اول چند چیزوں کا ذکر کیا جائے۔ اس کے بعد چند اور چیزیں ایسی بیان کی جائیں جو ان پہلی چیزوں کے ساتھ نسبت رکھتی ہوں۔ (مرتب)

۴۔ یہاں اشارہ ہے سورہ قیامہ کی آیت ۱۸ فاذا قرأناه فاتبع قرانه (تو جب ہم اس کو سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو) کی طرف۔ اس آیت کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں .

> "مزید اہتمام اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہر رمضان میں نبی ﷺ حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ اتنے قرآن کا مذاکرہ فرماتے جتنا نازل ہو چکا ہوتا تاکہ کسی سہو نسیان کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات مبارک کے آخری رمضان میں آپ نے یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا۔ اسی کی طرف قرانه کے لفظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے"۔ (تدبر قرآن ج ۹، ص ۸۶) (مرتب)

۵۔ بخاری۔ کتاب الادب باب ما یجوز من الشعر

۶۔ بخاری۔ کتاب الطب باب من البیان السحر

۷۔ (جامع ترمذی۔ کتاب الزہد۔ باب ۸)

۸ مراد ابو مسلم اصفہانی (م 332ھ) ہیں جن کی تفسیر جامع التاویل کے نام سے ہے۔ انہوں نے ایک کتاب الناسخ والمنسوخ کے نام سے لکھی جس کی طرف مصنف علیہ الرحمۃ نے اشارہ کیا ہے۔ (مرتب)

۹ مراد سر سید احمد خان ہیں۔ (مرتب)

۱۰ سر سید احمد خان کا یہ خیال غلط ہے کہ عربوں نے تمام مذہبی باتیں یہود سے اخذ کیں اور اسلام نے بھی اکثر احکام یہود ہی سے لیے اور دین حنیفی کے آثار میں سے صرف توحید، ڈاڑھی اور ختنہ باقی رہ گئے تھے۔ (مصنف)

۱۱ مثلاً معاشرتی احکام میں معروف کا لحاظ بہت زیادہ ہے۔ سورہ البقرہ، سورہ النساء اور سورہ الطلاق کی متعدد آیات اس کی شاہد ہیں۔ (مرتب)

۱۲ یہ روایت صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب واتخذالله ابراھیم خلیلا میں آئی ہے۔ اس کی رو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین مرتبہ جھوٹ بولا۔ مولانا اصلاحیؒ کے نزدیک اگر کذب کے معنی توریہ کرنے کے لیے جائیں تو اس روایت کا صحیح محمل معین ہو جاتا ہے۔ اور عربی زبان کی رو سے یہ معنی لینے ممکن ہیں۔ (مرتب)

۱۳ اشارہ ہے اس روایت کی طرف جس کے مطابق نبی ﷺ جب سورہ النجم کی آیات کی تلاوت فرما رہے تھے تو ایک جملہ کفار نے بتوں کی شفاعت کے حق میں بولا۔ نبی ﷺ نے العیاذ باللہ اس جملہ کو وحی سمجھتے ہوئے ادا کر دیا۔ (مرتب)

۱۴ بعض مرتبہ یتیموں کی پرورش یا اس قسم کی کوئی دوسری معاشرتی یا اخلاقی و اجتماعی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں رکھے (مترجم)

۱۵ آیت تطہیر سے مراد سورہ الاحزاب کی آیت ۳۳ ہے۔ شیعہ کے نزدیک اس کا مصداق حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرات حسن و حسینؓ ہیں۔ (مرتب)

۱۶ کلیلہ و دمنہ عباسی عہد کے مشہور ادیب ابن المقفع کی تصنیف ہے جس میں جانوروں کے ایک قصہ میں اجتماعی اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے۔ (مرتب)

۱۷ مثلاً سورہ یوسف میں حضرت یوسف کی دعا کا ذکر ہے کہ اے رب مجھے قید خانہ گناہ کی زندگی سے زیادہ محبوب ہے۔ اور عزیز مصر کے اہل خاندان کا یہ فیصلہ بھی بیان ہوا ہے کہ یوسف کو کچھ مدت کے لیے قید کر دیا جائے لیکن ان کے قید کیے جانے کا ذکر الفاظ میں نہیں ہوا۔ اسی طرح حضرت یوسف کے وزیر بننے کے بعد ان کے انتظامات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا کہ قحط سے قبل انہوں نے غلے کی حفاظت کیسے کی اور قحط کے

دوران اس کی تقسیم کا اہتمام کیا ہوا- قصہ یک لخت بھائیوں کی مصر آمد پر آنکلتا ہے- بھائیوں کی پہلی اور دوسری آمد کے درمیان کی تفصیلات بھی حذف ہیں- قاری خود سمجھ لیتا ہے کہ فلاں واقعہ کے بعد کیا ہوا ہو گا-(مرتب)

۱۸ ان آیات میں اہل کتاب کو تنبیہ ہے اور صاحب تدبر قرآن کے الفاظ میں "یہ تنبیہ اتنی سخت و شدید ہے کہ لفظ لفظ سے جوش غضب ابلا پڑ رہا ہے- پوری تقریر از ابتدا تا انتہا صرف فرد قرارداد جرائم پر مشتمل ہے اور کلام کے جوش اور روانی کا یہ عالم ہے کہ بات شروع ہونے کے بعد یہ متعین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ختم کہاں ہوئی- اس قسم کے پر جوش اور پر غضب کلام میں عموماً خبر حذف ہو جاتی ہے، گویا متکلم کا جوش ہی خبر کا قائم مقام بن جاتا ہے اور مبتدا ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ متکلم کیا کہنا چاہتا ہے"-(مرتب)

۱۹ مراد زرقاء الیمامہ ہے جس کا تعلق یمامہ کے قبیلہ بنو جدیس سے تھا اور وہ نظر کی تیزی کے لیے مشہور تھی- کہا جاتا ہے کہ زرقا تین دن کی مسافت کے علاقے کو دیکھ سکتی تھی-(مرتب)

۲۰ حارث بن حلزہ یشکری- جاہلی شاعر جس کا قصیدہ معلقات میں شامل ہے-(مرتب)

۲۱ بصرہ کے مشہور ادیب قاسم بن علی حریری (م ۵۱۶ھ) جن کی متعدد کتابوں میں سے مقامات حریری بے حد مشہور ہے-(مرتب)

۲۲ مثال کے طور پر روزہ کی فرضیت ہوئی تو ابتدا میں اس بات کی گنجائش تھی کہ ایک بیمار یا مسافر جس کے رمضان کے روزے چھوٹ گئے ہوں وہ قضا روزوں کی تلافی مسکین کو کھانا کھلا کر کر سکتا ہے-(دیکھیے سورہ بقرہ ۱۸۴) کچھ عرصہ کے بعد آیت نازل ہوئی جس میں یہ گنجائش ختم کر دی گئی اور قضا روزوں کی تلافی دوسرے ایام میں روزوں ہی کے ذریعہ ضروری قرار دی گئی- اس آیت کے سلسلہ کلام ہی میں آیت ۱۸۵ کو توضیح کے طور پر رکھ دیا گیا-

سورہ انفال میں اہل ایمان کو جہاد پر ابھارا گیا تو یہ خبر دی گئی کہ بیس ثابت قدم مسلمان دو سو کافروں پر بھاری ہوں گے کیونکہ انھیں اللہ تعالیٰ نے بصیرت ایمانی سے نوازا ہے-(آیت ۶۵) بعد میں مسلمانوں کی کثرت کے دور میں بعض مسلمانوں کے کردار کی ناپختگی کے باعث ان کی ذمہ داری میں تخفیف فرمائی اور ایک سو ثابت قدم مسلمانوں کو دو سو کافروں پر غلبہ عطا کرنے کا وعدہ کیا- یہ آیت ۶۶ سابق آیت کے پہلو میں رکھی گئی-(مرتب)

۲۳ اس تتمہ کی مثال سورہ نساء اور سورہ مزمل کی آخری آیات میں دیکھی جا سکتی ہے-(مرتب)

۲۴ یہاں مصنف علیہ الرحمہ ابواب سے مراد سورہ کی آیات کے وہ مجموعے لے رہے ہیں جو ایک مضمون

کے حامل نظر آتے ہیں-(مرتب)

۲۵ اس صورت میں بالعموم کذلک یبین الله آیته للناس یا اس سے ملتے جلتے الفاظ وضاحتِ احکام کے بعد آتے ہیں- مثال کے طور پر دیکھیے سورہ بقرہ کی آیات ۱۸۷، ۲۱۹، ۲۲۱، اور ۲۴۲- سورہ نور کی آیات ۵۸، ۶۱(مرتب)

۲۶ سور کے معنی دیوار اور فصیل کے آتے ہیں-(مرتب)

۲۷ اس کی مثال سورہ طلاق کے احکام ہیں جو سورہ کے ایک بڑے حصہ پر پھیلے ہوئے ہیں- لیکن وہ اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے آئے ہیں کہ نفرت و بغض میں بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ضروری ہے-(مرتب)

۲۸ مثال کے طور پر سورہ حدید کے بعد سورہ مجادلہ اس کی تابع بن کر آئی ہے جس میں منافقین کے کردار کی تفصیل ہے جس کا مجمل ذکر حدید میں ہوا ہے- اسی طرح سورہ جمعہ کے بعد سورہ منافقون اس کی تابع بن کر آئی ہے- اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر نبی ﷺ کے خطبہ جمعہ کے معاملہ میں غیر ذمہ دارانہ روش اختیار کی گئی تو اس کے نتیجہ میں نفاق کا مرض پیدا ہو سکتا ہے- اس کی تفصیل سورہ منافقون میں ہے-(مرتب)

۲۹ مثال کے طور پر سورہ تغابن میں واضح کیا گیا کہ ایمان کے تقاضوں کو بروئے کار لانے میں آدمی کے اہل و عیال رکاوٹ بن جاتے ہیں- ان کے معاملہ میں آدمی کو ہوشیار رہنا چاہیے- اس کے بعد سورہ طلاق اور سورہ تحریم دو تابع سورتیں رکھ دی گئیں- ان میں سے پہلی میں بیویوں کے ساتھ ناراضی یا نفرت کی صورت میں خدا خوفی اور تقویٰ کا معاملہ کرنے کی ہدایت کی گئی جبکہ سورہ تحریم میں ان کی محبت اور دلداری میں دین کی حدود کو پامال کرنے کے خطرات سے متنبہ کیا گیا-(مرتب)

۳۰ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے نزدیک سورہ حج قبیل ہجرت کی مکی سورہ ہے- یہ اپنے مزاج و مطالب سے لحاظ سے مکی ہے- اس کی صرف چا آیات (۳۸ تا ۴۱) ہجرت کے بعد کی ہیں- انھی چند آیات کی بنا پر مفسرین نے اس سورہ کے مکی یا مدنی ہونے کے باب میں اختلاف کیا ہے- لیکن ان آیات کی نوعیت ماسبق مضمون کی توضیح کی ہے اس وجہ سے مصحف کی ترتیب میں ان آیات کو مکی آیات میں جگہ ملی- یہ اسی طرح کی بات ہے جیسے مکی سورہ مزمل کے آخر میں ایک آیت مدنی، جو توضیحی آیات کی نوعیت کی ہے، رکھ دی گئی ہے- اس کے باوجود سورہ مزمل کو بالاتفاق مکی مانا جاتا ہے- لہٰذا سورہ حج کو چند توضیحی مدنی آیات کی بنا پر مدنی نہیں قرار دیا جا سکتا- صاحب کشاف نے بھی اس سورہ کو مکی قرار دیا ہے-(دیکھیے تفسیر سورہ حج، عنوان 'سورہ کا عمود اور زمانہ نزول' تدبر قرآن)

مولانا اصلاحی کے نزدیک سورہ حج کی ہے، اس سے آگے سورہ المومنون بھی کی ہے۔لہذا سورتوں کا تیسرا گروپ ان کے نزدیک سورہ یونس سے شروع ہو کر سورہ نور پر ختم ہوتا ہے۔(مرتب)

۳۱ مولانا اصلاحی کی تحقیق میں سورہ النصر اور اس سے آگے کی تمام سورتیں مدنی ہیں۔ سورہ اللھب غزوہ بدر کے قریب نازل ہوئی اور اس میں معاندین اسلام کے انجام کی خبر دی گئی۔ سورہ الاخلاص کے نزول کا زمانہ وہ ہے جب مدینہ میں اہل کتاب اور بالخصوص نصاریٰ کی مخالفت بالکل آشکارا ہو گئی۔اس طرح قرآن مجید کی سورتیں سات گروپوں میں تقسیم ہیں جن میں سے ہر گروپ کی سورتوں سے شروع ہو کر مدنی سورتوں پر ختم ہوتا ہے۔(مرتب)

۳۲ مولانا اصلاحیؒ نے قرآن مجید کے مجموعی نظم کے بارے میں بعض نئی تحقیقات پیش کی ہیں۔وہ فرماتے ہیں:

"قرآن مجید کی تلاوت اگر غور و تدبر کے ساتھ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورتیں جوڑا جوڑا ہیں۔ ہر سورہ اپنا مثنیٰ رکھتی ہے۔ان دونوں میں اس طرح کی مناسبت ہے جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ایک میں جو پہلو مخفی ہے دوسری اس کو اجاگر کرتی ہے۔اگر آپ سورتوں کی اس ترتیب پر ایک نظر ڈالیں جس ترتیب سے وہ مصحف میں ہیں تو یہ چیز بھی آپ کو بالکل صاف نظر آئے گی کہ قرآن مجید میں کی اور مدنی سورتوں کے ملے جلے سات گروپ بن گئے ہیں جن میں سے ہر گروپ ایک یا ایک سے زیادہ کی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے۔ہر گروپ میں پہلے کی سورتیں ہیں ان کے بعد مدنی سورتیں ہیں۔جب میرے سامنے قرآن عظیم کے یہ ساتوں گروپ آتے ہیں اور ساتھ ہی سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے پر نظر پڑتی ہے تو بے ساختہ میرا ذہن وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔اور اسی بنیاد پر میں قرآن عظیم کی ترتیب کو منصوص مانتا ہوں"۔

(اصول فہم قرآن، ص ۱۹)

مولانا کے نزدیک جس طرح ہر سورہ کا ایک خاص عمود ہوتا ہے اسی طرح سورتوں کے ہر گروپ کا بھی ایک خاص عمود ہے۔(مرتب)

۳۳ یعنی (۱) نظم قرآن (۲) تاویل قرآن بالقرآن (۳) مخاطب کا لحاظ (۴) شاذ معنی کا ترک۔(مرتب)

۳۴ مصنف علیہ الرحمہ کا مفہوم درج ذیل آیات سے واضح ہوتا ہے:

۱۔واتقوا اللہ واعلموا انکم الیہ تحشرون (مائدہ: ۹۶، مجادلہ: ۱)

(اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے)

۲-و ان اقیموا الصلوۃ و اتقوہ وھو الذی الیہ تحشرون- (انعام: ۷۲)

(اور حکم دیا گیا ہے) کہ نماز قائم کرو اور اس سے ڈرو اور وہی ہے جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے)

(مرتب)

۳۵ مثال کے طور پر درج ذیل آیات ہیں-

۱-واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ بکل شیء علیم (بقرہ: ۲۳۱)

(اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے)

۲-واتقوا اللہ ان اللہ علیم بذات الصدور-(مائدہ: ۷)

(اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ سینوں کے بھیدوں کو جانتا ہے)

۳-واتقوا اللہ ان اللہ سمیع علیم (حجرات: ۱)

(اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے)(مرتب)

۳۶ مثلاً ذیل کی آیت میں:

وقال الذی نجا منھما واذکر بعد امۃ انا انبئکم بتاویلہ فارسلون

(یوسف: ۴۵)

(اب وہ شخص جو دونوں قیدیوں میں سے رہائی پا گیا تھا اور جسے ایک مدت کے بعد وہ بات یاد آگئی بولا کہ میں آپ کو اس کی تعبیر بتاتا ہوں مجھے بھیجئے) (مرتب)

۳۷ مثلاً اس آیت میں:

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف (آل عمران: ۱۰۴)

(اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائیں اور نیکی کا حکم دیں)(مرتب)

۳۸ مثلاً اس آیت میں:

انا وجدنا اباء نا علی امۃ و انا علی آثارھم مقتدون (زخرف: ۲۳)

(ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک رستہ پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں)(مرتب)

۳۹ زاد المعاد ج ۱، ص ۱۳۹